# ای ایف یو

## ایک تحریک

### تشکیلِ پاکستان کے تناظر میں
### ایک ادارے کی تعمیر و ترقّی

مصنّف : وولفرام کرنوسکی

مترجم : باقر نقوی

اوّلین اردو اشاعت 2007ء

جملہ حقوق محفوظ

اس کتاب کا کوئی حصہ یا اقتباس مصنف/مترجم/ادارے کی اجازت کے بغیر نقل نہیں کیا جا سکتا۔
بلا اجازت ایسی کسی کارروائی پر قانونی چارہ جوئی کا حق استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا جملہ کام اکادمی بازیافت، کتاب مارکیٹ، آفس #17، گلی #3، اردو بازار
کراچی، فون 2751428 کے زیرِ اہتمام ہوا۔

ای ایف یو کے روحِ رواں

# روشن علی بھیم جی

کے نام

# ترتیب


چند باتیں ... ۱۱

پیش لفظ ... ۱۳

پیش گفت ... ۱۶

تشکر ... ۲۰

تعارف ... ۲۲

پہلا باب

آزادی کا سفر اور مسلمان ... ۲۵

**ہندوؤں کی نشاۃ ثانیہ**

۲۷

**سر سید احمد خان**

عظیم مصلح: بابائے علی گڑھ

۳۱

**نئی صدی کی آمد**

آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل

۴۱

**علامہ ڈاکٹر محمد اقبال**

شاعرِ مشرق

۴۸

**قائداعظم محمد علی جناح**

معمارِ پاکستان

۶۰

**ایک نئی مملکت کا ظہور**
کامیابی یا غیر فیصلہ کن برابری؟
۷۱

دوسرا باب

ای ایف یو اور پاکستان کی اُبھرتی ہوئی صنعت کاری ... ۷۶

**ای ایف یو کی تخلیق**
۸۵

**پاکستان میں بیمے کی صنعت کے پہل کار**
این اے قاضی
۹۵
محمد چودھری
۹۷
ایم اے چشتی
۹۹
ایس سی سجالی
۱۰۱
اعجاز اللہ صدیقی
۱۰۵
رُوسی دُباش
۱۰۸
معین قدّا
۱۱۱

تیسرا باب

ناقابلِ فراموش افراد کے خاکے اور حالاتِ زندگی ... ۱۱۵

سرپرست

**عالی مرتبت نوّاب بھوپال**
۱۲۱

**عالی مرتبت آغا خان**
۱۳۴

بنیادکار

**عبدالرحمٰن صدیقی**
ایک نڈر، اور صاف گو مثالیت پسند
۱۴۹

**خوند کر فضلِ حیدر**
بھوپال سے ہمارے ساتھی
۱۶۷

**عباس خلیلی**
ہمارے مدراسی ساتھی
۱۸۳

**اصفہانی خاندان**
زیبِ داستان
۱۹۷

**راجا صاحب محمود آباد**
ایک ذی شرف درویش
۲۰۸

**اراگ خاندان**
مشکل وقت کا ساتھی
۲۱۹

**ایس ایم یوسف**
ایک بے مثال سرکاری افسر
۲۲۵

**سعید احمد**
اعتبار کا قلعہ
۲۳۰

**جہانگیر صدیقی**
مالیات کے جادوگر
۲۳۸

**محمد علی سعید**
ماہرِ قانون اور خاندان کا ایک فرد
۲۴۷

**جسٹس میاں محمد محبوب**
ایک محافظ، ایک مصلح
۲۵۲

**اشرف تابانی**
سندھ کے ہمارے گورنر
۲۵۸

**تصاویر۔۱**
۲۶۱

# عظیم شراکت دار شخصیات


**اِرون سی آئیون**

جرمنی کا رابن ہڈ

۲۷۹

**خدا بخش**

بیمۂ زندگی جن کی زندگی کا مقصد تھا

۲۸۸

**ایس ایم معین الدین**

ایک سچا دوست

۲۹۶

**ہائنز شوارز**

روشنی کا مینار

۳۰۳

**میاں سعید احمد**

ایک لاہوری سلسلہ

۳۱۰

**سید سبطِ حسن**

جتنے بڑے ادیب اتنے ہی بڑے آدمی

۳۱۷

**ایس ایف عالم**

ایک بے عیب اور معتبر انسان

۳۲۷

**شرافت علی والا جاھی**

ہمیشہ ایک قدم آگے

۳۳۰

**ساجد زاھد**

ایک آزاد منش

۳۴۰

**نواب حسن**

سفید فام اشرافیہ کا ایک فرد

۳۴۸

**عظیم رحیم**

بنگالی اندازِ شرافت

۲۵۵

**سلطان احمد**
سنگِ خارا
۳۵۹
**ڈاکٹر محمد سعید خان**
ایک پہل کار طبیب
۳۶۴
**ابو المحمو د**
کامیابی کا نشان
۳۶۷
**ایس اے رشید**
آپ کا مخلص
۳۷۱
**محمود جعفری**
غیر منجمد خفیہ خزانہ
۳۷۵
**مرزا فیض احمد**
زمین سے آسمان تک
۳۷۹
**محمد حسین علوی**
شہابِ ثاقب
۳۸۳
**ابا علی یوسفی**
نگہبان
۳۸۹
**محمدفصیح الدین**
ایک تیکنیکی ضمیر
۳۹۴
**ڈاکٹر تاج الدین مانجی**
ہمیشہ حاضر
۳۹۹
**حسن علی عبداللہ**
ناقابلِ خرید وفروخت جنس
۴۰۵
**طاہر ساچک**
ایک غیر متوقع نعمت
۴۰۹

**سیف الدین زومکاوالا**
آزاد بھی اور منسلک بھی
۴۱۹

**تصاویر۔۲**
۴۳۱

**کتابیات**
۴۴۷

**اِشاریہ**
۴۵۲

# چند باتیں

باقر نقوی

کیا ترجمہ کرنا آسان کام ہے؟ آسان بھی ہے اور مشکل بھی! یہ ترجمہ کرنے والے پر منحصر ہوتا ہے وہ کون سا راستہ اختیار کرے۔

جب کسی متن کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جارہا ہو، جس کو آسان سے لفظ میں ترجمہ کہتے ہیں، تو مترجم پر آگے اور پیچھے، دونوں سمت سے ایک جیسی یلغار ہوتی۔ پہلی زبان تقاضا کرتی ہے کہ منتقلی کے عمل میں کسی بھی قسم کے الفاظ استعمال کیے جائیں مگر متن کا لہجہ اور اس کی روح سے بد دیانتی نہیں ہونی چاہیے۔ اور وہ زبان جس میں ترجمہ کیا جارہا ہو، تقاضا کرتی ہے کہ متن جیسا بھی ہو، استعمال کیے جانے والے الفاظ اور محاوروں کا لغوی اور معنوی احترام کیا جانا چاہیے۔ گویا، متن کا لہجہ اور روح دونوں کیسے بھی ہوں میزبان زبان کی تہذیب اور آداب کو مجروح نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسا مشکل مرحلہ ہوتا ہے جس سے گزرنا آسان نہیں۔

میں نے حتی الوسع ان دونوں صورتوں سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالاں کہ ترجمے کے دوران ایسے بہت سے مقام آئے تھے جہاں میرے دل میں بے ساختہ کچھ انحراف کی خواہش ابھری تھی مگر میں نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بعض کیفیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں کبھی متن عبارت پر حاوی ہو جاتا اور کبھی عبارت متن پر قابض ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں اچھا ترجمہ وہ ہوتا ہے کہ متن سے انصاف کے ساتھ ساتھ اس کی عبارت ایسی ہو کہ قاری ایک بار پڑھنا شروع کردے تو پڑھتا ہی چلا جائے۔

لیجیے! اب کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور مطالعے کے بعد آپ خود فیصلہ کیجیے گا کہ آپ کو اس کے مطالعے میں لطف آیا یا نہیں۔ اگر نہیں تو میری تقریباً دو برس کی محنت اکارت گئی۔

اس تمہید کے بعد میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مصنف، جناب وولفرام کرنوسکی کو خراجِ تحسین پیش کروں جنھوں نے ایک غیر ملکی (جرمن) ہوتے ہوئے برّصغیر کے حالات اور معاملات کا ایسا تجزیہ کیا ہے کہ اگر اس کتاب سے ان کا نام ہٹا کر کسی ہندوستانی یا پاکستانی کا نام لکھ دیا جائے تو قاری کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ یہ کتاب کسی غیر ملکی کی لکھی ہوئی ہے۔ انھوں نے جس محنت، محبت اور عالی نظری سے واقعات کی تفصیلات جمع کیں اور افراد کی کیفیات کا تجزیہ کیا ہے، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

میں پچھلے دس برس سے شاعری ایک طرف رکھ کر نثر کی طرف راغب ہو گیا ہوں۔ میں نے اس عرصے میں اردو زبان میں مختلف النوع مضامین کی پانچ کتابیں تحریر کی ہیں۔ اٹھارہ سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتابیں ''الفریڈ نوبیل۔ حیات اور نوبیل انعامات،'' ''جینیات،'' ''برقیات مع مختصر تاریخ،'' ''مصنوعی ذہانت۔ ایک مختصر جائزہ'' اور ''نوبیل اور ادبیات'' جیسے (اردو کے لیے) اجنبی موضوعات پر مبنی ہیں۔ آخر الذکر کتاب ادب کے انعام یافتگان کے کوائف کے ساتھ انعام دینے کی تقریبات میں پیش کیے گئے طویل اور پُر مغز خطبات کے تراجم پر مشتمل ہے۔

میں نے دانستہ یہ کوشش کی ہے کہ اردو میں سائنسی موضوعات پر لکھ کر اپنی زبان کی کچھ خدمت کروں، اور شاعری کو 'ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرانِ شعر ونغمہ' کے لیے چھوڑ دوں۔ اگر چہ میرے خیال میں زبان کے لیے ان کی خدمات ضرورت سے کہیں زیادہ ہیں۔

میں کُل وقتی ملازمت بھی کرتا ہوں اس لیے اس قسم کے کام کے لیے میرے پاس وقت کی کمی رہتی ہے۔ اس پر مستزاد میری افتادِ طبع ہے کہ جو کچھ بھی کرو دل لگا کر اور ایمان داری سے کرو۔ جلد بازی سے کام خراب ہوتے ہیں جب کہ تخلیقی کام عرق ریزی کے لیے فرصت کے رات دن ڈھونڈتا ہے۔ اور جب فرائضِ منصبی ہی خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیں تو ایسے غیر پیشہ ور کام کے لیے وقت کہاں سے نکلے۔ یہ میرے لیے سب سے بڑی مشکل تھی، ہے اور زندگی بھر رہے گی۔ تو پھر یہ اٹھارہ سو صفحات کس طرح وجود میں آئے؟ یہ سوال ذاتی نوعیت کا ہے اور اس کا جواب دینا ڈینگ مارنے کے مترادف ہوگا اس لیے میں جواب دینے سے پرہیز کروں گا۔

چوں کہ اس کتاب کا موضوع میرے پسندیدہ موضوعات سے بالکل الگ تھا اس لیے اس کے ترجمے کے دوران کبھی کبھی میں ہار ماننے لگتا تھا۔ میری شریکِ حیات فیروزہ بیگم جب مجھے الجھتا دیکھتیں تو دل جوئی کے لیے کچھ آرام کا مشورہ دیتیں۔ ایسی ہی کیفیت میں ایک بار میرے منھ سے نکل گیا کہ بس کل ہی میں سیف الدین صاحب سے معذرت کرلوں گا کہ میں اس کام کو پورا نہیں کرسکتا۔ یہ سنتے ہی فیروزہ بیگم مسکرائیں اور بولیں، یاد رکھیے کہ یہ کام آپ احسان کے طور پر نہیں کر رہے ہیں۔ یہ تو آپ کا فرضِ منصبی ہے اور آپ اس کام سے انکار نہیں کر سکتے۔ غرض 'مرتا کیا نہ کرتا'۔ مرا تو نہیں بس کرتا رہا۔ اس لیے اس کام کے لیے سیف الدین زومکاوالا صاحب، کو صرف فیروزہ بیگم کا ممنون ہونا چاہیے، میرا نہیں۔

مندرجہ بالا جملۂ معترضہ کے بعد میں سیف الدین زومکاوالا اور طاہر ساچک صاحبان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کام کے لیے مجھے منتخب کیا، اس لیے کہ ای ایف یو کے معماروں کی تاریخ میں میرا نام نہیں تو کم از کم مترجم کی حیثیت سے میں اس کی تاریخ سے ہمیشہ منسلک رہوں گا۔

# پیش لفظ

## رفیق بھیم جی — منیر بھیم جی

## سیف الدین زومکا والا

زیرِ نظر کتاب کے مصنف وولفرام کرنوسکی ، جناب روشن علی بھیم جی اور ای ایف یو (ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی ) کے معاملات آپس میں اتنے گتھے ہوئے ہیں کہ ای ایف یو ساگا اور ان کے دوست جناب بھیم جی کی سوانحِ حیات کی تصنیف کے لیے مصنف سے بہتر کوئی شخص میسّر نہیں ہوسکتا تھا۔

بھیم جی اور کرنوسکی صرف ایک مشترک پیشے ہی سے منسلک ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی سوچ اور اپنے نظریات کی ہم آہنگی کی وجہ سے بھی ایک دوسرے سے بہت قریب رہے ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ ''روشن میرے نزدیک بڑے بھائی کی طرح تھے۔ انھوں نے کوئی بھی ایسا اقدام نہیں کیا، خواہ وہ ای ایف یو یا دوسرے منصوبوں سے متعلق ہو، جس کا مجھے علم نہ ہوا ہو۔''

ایک شام دورانِ گفتگو دونوں دوست اس بات پر متفق ہوگئے تھے کہ ای ایف یو میں ضرور ایسی کوئی خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کے بنیاد گزاروں میں نوّاب صاحب بھوپال جیسی شخصیت بھی شامل ہوگئی تھی، جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور پاکستان کی تخلیق کے سلسلے کی ایک نمایاں شخصیت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان دو حضرات نے طے کیا تھا کہ ای ایف یو کی تاریخ مرتب کی جانی چاہیے جس میں پاکستان کی تخلیق کی بھی مختصر تاریخ شامل ہو۔

کرنوسکی کہتے ہیں، ''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں یہ کتاب خود لکھوں گا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس ادارے کے چند نوجوان افسروں اور کچھ تجربے کار محقق حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی کی صدارت کے فرائض انجام دوں گا جس کو یہ کام سونپا جائے گا، مگر مجھے جلد ہی احساس ہوگیا کہ یہ کام محض اس قسم کی 'ٹاسک فورس' کے بس کا نہیں ہوگا۔'' یقیناً وولفرام کرنوسکی کے اندر کا پوشیدہ مصنف انگڑائیاں لے رہا تھا جو اپنے لڑکپن کے دور میں جرمن زبان میں مختصر افسانے، مضامین اور نظمیں لکھتا رہا تھا۔

وولفرام کرنوسکی جرمنی کے مشہور شہر ہیمبرگ میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے بیمے، فنونِ لطیفہ اور موسیقی کے مضامین کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جب وہ ہیمبرگ کی کالج آف آرٹ اینڈ میوزک میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو انھیں موسیقی اور ادب دونوں میں گہری دل چسپی ہوگئی تھی۔ لہٰذا اس کتاب کی تصنیف کا ارادہ گو کہ ان کے لیے ایک دھچکے کی طرح تھا لیکن، صحیح معنوں میں وہ اس کام کے لیے موزوں ترین شخص تھے۔

جو کام اگست ۱۹۹۷ میں شروع ہوا تھا وہ محبتوں اور محنت پر مبنی تھا مگر اس میں کم دشواریاں نہیں تھیں۔ کتاب لکھنے کے لیے مواد اکٹھا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ انھیں کم از کم ستّر افراد سے طویل گفتگو کرنا تھی، جن میں سب سے پہلے ان کے اپنے پیارے دوست روشن علی بھیم جی تھے۔ دوسرا دھچکا انھیں اس وقت لگا جب ان کے سامنے تفصیلات سے پُر بہتّر آڈیو ٹیپ رکھی ہوئی تھیں جن کو سن کر ان میں موجود مواد کی

ترتیب اور تحریر کے لیے کوئی مددگار میسّر نہیں ہوا۔ اس ہمالیائی کوشش سے آگے، جس سے ایک ہزار چار سو صفحات سیاہ ہوئے تھے، یہ بھی مرحلہ تھا کہ مزید مواد کے لیے انھیں پاکستان کی تاریخ پر تحقیق کرنی تھی جس کے لیے ہزاروں صفحات کھنگالنے تھے۔ ان مراحل کے بعد بالآخر ۱۹۹۸ء میں انھوں نے انڈونیشیا کے تفریحی مقام بالی سے تحریر کا سلسلہ شروع کیا جو ۱۹۹۹ میں امریکی ریاست فلوریڈا میں ان کی تفریحی تعطیل کے دوران جاری رہا اور باویریا کے پہاڑی سلسلے کے قریب جھیل Starnberg کے ساحل پر واقع Tutzing کے حسین باغیچے تک چلتا رہا جہاں موسمِ سرما کی برف باری سے بچنے کے لیے کرنوسکی پناہ گیر ہوتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ اور موسیقی کی تعلیم کے بعد، اپنے والد کے اصرار پر، وولفرام کرنوسکی نے ۱۹۵۳ء میں ایک زیرِ تربیت افسر کی حیثیت میں ایک بیمہ کمپنی میں ملازمت کر لی۔ ساتھ ہی انھوں نے ہیمبرگ میں انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے امتحانات بھی دیے اور امتیازی کامیابی حاصل کی۔ وہ غالباً اس آخری پرانی نسل سے تھے جو دوسری جنگِ عظیم میں شمولیت سے بچ رہی تھی۔ اس زمانے میں نوجوان کارپردازوں کی کمی تھی جس کی وجہ سے کام کرنے کے لیے جرمن نوجوانوں کو بہت سے مواقع حاصل تھے۔ بیمے کی صنعت میں کچھ ملازمتوں کے بعد خوش قسمتی سے ۱۹۵۹ء میں انھیں مشہورِ زمانہ میونخ ری انشورنس کمپنی میں ایک افسر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ یہ ملازمت ایسی تھی جس میں انھیں سفر کرنے اور دنیا دیکھنے کے بہت مواقع نصیب ہوئے۔

میونخ ری کی ایما پر ۱۹۶۰ء میں ان کو ای ایف یو انتظامیہ کی امداد کے لیے اس کے صدر دفتر کراچی میں منیجر کی حیثیت میں تعینات کیا گیا تھا۔ وہ کہتے ہی کہ ''میں ای ایف یو میں روشن علی بھیم جی سے پہلے شامل ہوا تھا۔'' جب بھیم جی، جو بنیادی طور پر بیمۂ زندگی کے آدمی تھے، ۱۹۶۱ء میں کمپنی کے جنرل منیجر بنے تو جنرل انشورنس کے میدان میں کرنوسکی ان کے تکنیکی مددگار ہو گئے۔ ان کے مراسم آپس کے اعتماد اور ایک دوسرے کی پسندیدگی پر قائم ہوئے۔ بھیم جی نے ایشیا اور ایشیائی ذہنیت کو سمجھنے میں کرنوسکی کی مدد کی جس کے عوض کرنوسکی نے بھیم جی کی، بیمے اور دوسرے معاملات کے سلسلے میں سفر میں ان کی معاونت کی۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کرنوسکی نے کریڈٹ اینڈ کامرس گروپ کی تین کمپنیوں کی ترتیب اور قیام میں اپنے دوست روشن علی بھیم جی کی اس وقت معاونت کی جب انھوں نے ۱۹۷۲ء میں پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کرنوسکی کہتے ہیں کہ ''پاکستان میں ہمارا قیام بڑا دل چسپ رہا تھا، اس قدر کہ یہ ملک ہمیں اپنا دوسرا وطن لگتا تھا۔'' ان کی اہلیہ ارسلا، جو خود ایک پیشہ ور خاتون تھیں، اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان آئیں، جہاں ان کو جرمنی کے سفارت خانے میں ملازمت بھی مل گئی، ایسی ملازمت جس سے ان کو بہت سارے فوائد حاصل ہوئے۔ کرنوسکی کی ملازمت کی نوعیت نے ان کو پاکستانیوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا۔ انھوں نے کہا کہ ''میرے زیادہ تر دوست پاکستانی تھے اور روشن نے مختلف النوع تہذیبی حلقوں سے متعارف ہونے میں میری امداد کی تھی۔''

فنونِ لطیفہ، ادب، تاریخ، سیاست وغیرہ میں گہری دل چسپی کے باعث کرنوسکی اور ان کی اہلیہ نے ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جس سے وہ پاکستان کے بارے معلومات حاصل کر سکتے، اور اپنے کتب خانے کے لیے نہایت قیمتی کتب اور دوسرے نوادرات حاصل کرتے۔ اس 'سنہرے دور' میں اپنے پاکستان میں قیام کے دوران کرنوسکی بے انتہا بے تکلفی سے اندرونِ سندھ اور پنجاب کے شہر شہر گاؤں گاؤں گھومتے، مقامی لوگوں سے گپ شپ کرتے اور اپنے اطراف اکٹھا ہونے والے لوگوں کے ساتھ چائے اور حقہ پیتے۔ ہر ماہ کرنوسکی اپنے گھر میں سندھی موسیقی اور مشاعرہ بھی کرتے اور اپنے دوستوں کو اس میں مدعو کرتے تھے۔

ان کے لیے سب سے زیادہ خوشی اور دل بستگی کا موقع وہ تھا جب ۱۹۶۳ء میں بندر روڈ، کراچی کے سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ اسپتال میں ان کی پہلی اولاد، کلاڈیا، تولد ہوئی تھی۔ کرنوسکی خاندان ۱۹۶۶ء میں میونخ واپس چلا گیا جہاں میونخ ری انشورنس کمپنی کی انتظامیہ میں ان کو

ایک بڑا عہدہ دیا گیا جس میں ان کی ذمے داریاں مشرقِ وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ میں ان کے ادارے کے مفادات کی دیکھ بھال کرنے پر منحصر تھیں۔ اسی برس ان کی دوسرے بیٹی اینڈریا میونخ میں پیدا ہوئی۔

ان کی اہلیہ ارسلا نے سفر ہو یا حضر، پاکستان، میونخ، جاپان یا دنیا کے کسی خطے میں جہاں ان کو ملازمت کی ذمے داریاں لے جاتیں، وولفرام کرنوسکی کی رفاقت کی۔ ہم نے ہمیشہ ارسلا کو اپنے شوہر کے ساتھ مسکراتے ہی پایا۔ وہ ہر معنوں میں ایک عظیم خاتون ہیں، مشرق اور مغرب کی مختلف اور رنگارنگ تہذیب کا ایک بے مثال آمیزہ!

وولفرام کرنوسکی کہتے ہیں کہ پاکستان میں اپنے چھ برس کے قیام میں ان کو ایشیائی ذہنوں کو پڑھنے کی صلاحیت نصیب ہوئی اور یہ ان کا پاکستان کا تجربہ ہی تھا جس کی مدد سے انھوں نے جاپان میں پانچ کامیاب سال گزارے تھے۔ وہاں بھی کرنوسکی جوڑا جاپانی تاریخ اور تہذیب کی رنگارنگی میں ایسا ڈوبا کہ وہ قدیم Kabuki اور Noh تھیٹر کا دلدادہ ہو گیا۔ کرنوسکی کو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ جاپان میں تو ان کو جاپانی زبان کی بنیادی تعلیم پر مجبور کیا جاتا رہا، جب کہ پاکستان میں مقامی زبان سیکھنے میں ان کی ہمت افزائی نہیں کی گئی۔ اردو بولنے اور سیکھنے کی ان کی تمام کوششیں رائگاں جاتیں۔ جب بھی وہ اردو بولنے کی کوشش کرتے تو ان کے مخاطب پاکستانی یہ سمجھ کر کہ شاید کرنوسکی کی نظر میں ان کی انگریزی اچھی نہیں، اس لیے وہ انگریزی بولنی شروع کر دیتے۔

کئی ترقیوں کے باعث وہ ۱۹۹۵ء میں میونخ ری انشورنس کمپنی کی اعلیٰ انتظامیہ کے رکن بن گئے اور پینتیس برس کی ملازمت کے بعد، جس کا بیش تر وقت ایشیائی ملکوں کے سفر میں گزرتا رہا تھا، وہ ریٹائر ہو گئے۔ پھر بھیم جی کے اصرار پر ۱۹۹۶ء میں انھوں نے دوبارہ ای ایف یو میں ڈائریکٹر اور مشیر کی حیثیت سے شمولیت قبول کر لی۔

کرنوسکی گھرانے کو خدا نے دو خوب صورت بیٹیوں سے نوازا ہے اور ان سے تین بچے ہیں جو ان کی والہانہ محبت کا مرکز ہیں۔ بیٹی کلاڈیا، جو بین الاقوامی بینکر تھی، اپنے شوہر اور دو بیٹوں کے ساتھ میونخ کے نواح میں، جہاں اس کے والدین مقیم ہیں، رہتی ہے۔ اینڈریا، جو ایک مینجمنٹ کنسلٹنٹ اور ادیب بھی ہے، برطانیہ کے شہرِ علم آکسفرڈ کے نواح میں اپنے شوہر اور بیٹی کے ہمراہ مقیم ہے اور ہینلے مینجمنٹ کالج اور کئی بین الاقوامی اداروں کے لیے مینجمنٹ پروگرام تیار کرتی ہے۔

کرنوسکی جوڑا اس قول پر ایمان رکھتا ہے کہ ''اگر آپ ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہیں تو زندگی بہت حسین ہوتی ہے۔'' اور اسی کے مطابق زندگی کی مصروفیات کے منصوبے بناتا ہے۔ وولفرام کرنوسکی ہمہ وقت ایک نئے باب کھولنے میں یقین رکھتے ہیں، لہٰذا، آج کل وہ اپنے ایشیائی تجربات کی بنیاد پر جرمن زبان میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ان کا ارادہ اپنی پیانو نوازی کو آگے بڑھانے کا بھی ہے۔ جسم کو صحت مند رکھنے کی خاطر ان کا ہر صبح دوڑنے کا معمول کبھی قضا نہیں ہوتا۔ وہ گالف بھی کھیلتے ہیں اور اپنی اہلیہ کے ساتھ پیراکی بھی کرتے ہیں اور یہ ساری مصروفیات ان کو صحت مند رہنے میں مدد دیتی ہیں۔

نومبر ۲۰۰۰ء، کراچی

# پیش گفت

مجھ سے بارہا یہ سوال کیا گیا ہے کہ ایک جرمن نژاد ہوتے ہوئے میں نے کسی پاکستانی ادارے کی تاریخ لکھنے کا بیڑا بھلا کیوں اُٹھا لیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ ادارہ جس کی عمر صرف ساٹھ برس کے لگ بھگ ہے، دنیا کے کسی بھی تجارتی معیار کے مطابق اس کی عمر کچھ اتنی سنسنی خیز بھی نہیں۔

اس کا جواب بہت آسان سا ہے۔ میرے خیال کے مطابق اس ادارے کی تاریخ عام قسم کی نہیں۔ اس کے ڈانڈے اس وقت سے ملتے ہیں جب ہندوستان کی سربرآوردہ شخصیتیں ایک ایسے ملک کے قیام کے خواب دیکھ رہی تھیں جو ان کا اپنا ہوگا نہ کہ ''تاجِ برطانیہ کا ایک نگینہ''۔ اور اس ادارے کے قیام کے پیچھے ایک دوررس نگاہیں رکھنے والا گروہ تھا، خواہ وہ سیاست داں ہوں، تاجر، طالب علم اور دانش ور، ہندو یا مسلمان، سب سمجھ رہے تھے کہ برطانوی راج کے ختم کیے جانے کا وقت آچکا تھا۔

زیادہ تر لوگ میں جن کے بارے میں لکھوں گا، مسلمان ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو اگرچہ اس خطے کے آبادی میں اقلیت تھا مگر اسی طبقے کے بزرگوں نے اس پر صدیوں حکومت کی تھی۔ یہ اپنے طبقے کی اس جدوجہد کے سرخیل تھے جس کا مقصد ہندوستان کی سیاست میں زیادہ شراکت حاصل کرنا تھا اور جو آخرکار اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل ہونے کے لیے ان کو اپنا ایک ملک، یعنی پاکستان بنانا ہوگا۔

اسی بنا پر میں نے ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کی تاریخ کو، اس میں مسلمانوں کے کردار کو اور اس ادارے کی تاریخ کو ایک ہی تناظر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں اس طرح پاکستان کے اس عظیم ادارے میں کام کرنے والے لوگوں کو اپنے ماضی میں جھانکنے اور اس ادارے کے اسلاف کے اہم کردار پر نظر ڈالنے کے مواقع ملیں گے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے قیام میں حصہ لیا، اس کو کامیابی کی ڈگر پر ڈالا بلکہ اس ملک کے بنانے اور اس کی ترقی میں بھی مدد کی۔

اگرچہ اس ملک میں گزرے ہوئے چالیس برسوں میں ہونے والی سیاسی، معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کا میں عینی گواہ ہوں مگر میں نے اس بات کی کوشش نہیں کی ہے کہ اس ملک کے قیام کے بعد سے ہونے والے تمام واقعات اور ان سارے تجزیوں اور تنقید کو دُہرایا جائے جس پر مجھ سے زیادہ ذمہ دار لوگ پہلے ہی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ حالانکہ سچ پوچھا جائے تو جس شخص نے چالیس برس تک بہت کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اس کو ان کو بیان کرنے کی کی کتنی شدید خواہش ہوگی، خاص کر اس وقت جب کہ یہ ملک اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہا ہو۔ میں وہ چھوٹی سے کہانی واقعی کبھی نہیں بھول سکتا جو میرے تاریخ کے پروفیسر نے مجھے یہ بتانے کے لیے سنائی تھی کہ تاریخ لکھنے والوں کے لیے یہ کتنا کٹھن ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں وہ حتی الامکان مطلق سچ کے برابر ہو۔

وہ چھوٹی سی کہانی کچھ یوں تھی: جن دنوں والٹر ریلے (Walter Raleigh) ٹاور آف لندن میں اپنے سزائے موت کے انتظار میں دن گزار رہا تھا، اس نے اپنے قید و بند کے دن دنیا کی تاریخ لکھنے میں صرف کرنے کی کوشش کی۔ ایک دن جب ریلے اپنے قید خانے کے دریچے سے باہر دیکھ رہا تھا، اس کا ایک دوست ٹاور کی جانب آتا دکھائی دیا۔ عین اسی وقت ٹاور کے برابر سے گزرنے والی سڑک پر کچھ لوگ آپس میں لڑ پڑے۔ تھوڑی ہی دیر بعد والٹر کا دوست اس کے پاس پہنچ گیا اور دونوں نے تھوڑی ہی دیر قبل ہونے والے واقعے کے بارے میں بات چیت کی۔ دونوں ہی اس بات پر حیرت زدہ ہوئے کہ ایک ایسے واقعے کے بارے جو چند لمحے قبل ہوا تھا ان کے بیان اور تشریح میں کتنا تضاد تھا۔ والٹر کا ملاقاتی فوراً ہی چلا گیا اور والٹر نے اپنے اب تک لکھے ہوئے مسودے کو نذر آتش کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جب دو آدمی، جو ایک دوسرے کے نظریے کا احترام کرتے ہیں، چند لمحوں قبل ہونے والے سادے سے واقعے پر ایک دوسرے سے مکمل اتفاق نہیں کر سکتے تو بھلا کوئی تجزیہ کرنے والا تاریخ داں ایسے واقعات کے بارے میں اعتبار سے کیا کہہ سکے گا جو وقت اور واقعے کے مطابق بہت پہلے ہو چکے ہوں۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعی کہانی ہے یا کوئی افسانہ، مگر خوب صورت ضرور ہے۔ یہ سب کہہ لینے کے باوجود میں ان معنوں میں مطمئن نہیں ہو سکتا کہ اگر ہر لکھنے والے نے سر والٹر ریلے کی مثال سامنے رکھی ہوتی تو آج تاریخ پر کوئی کتاب موجود نہ ہوتی۔ تو کیا دنیا کی تاریخ کے یہ سارے خود ساختہ چوکیدار شر انگیز نہیں ہیں یا اگر مثبت انداز اختیار کیا جائے تو یوں بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ نویسی کے عمل کے لیے کیا یہ لوگ ناگزیر ہیں؟ میرے خیال میں اس سوال کا جواب نہ صرف ہاں میں ہوگا بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر میں ایک افریقی کہاوت نقل کرنا چاہوں گا جو یوں ہے "جب سارے شیر فنا ہو جائیں گے تو شکاریوں کی کہانی سنانے کے لیے کون باقی رہے گا؟"

میں ان میں سے کسی زمرے میں نہیں آتا۔ میں تو صرف وہ کچھ محفوظ کر دینا چاہتا ہوں جس کا یا تو مجھ کو خود تجربہ ہوا ہے یا دنیا کے اس خطے میں رہنے والے دوستوں یا جاننے والوں سے جو کچھ حقیقتیں، تفصیلات، واقعات میرے علم میں آئے، اور ان افراد کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص پاکستان کی تخلیق کے سلسلے میں جد و جہد کی۔ اور پھر جب ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی تخلیق کا خواب حقیقت میں تبدیل ہوا تو ان ہی لوگوں میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو اس نئی مملکت کی سیاسی اور معاشی ترقی کی جد و جہد کے افق پر جھلملائے۔ ان سب کی پیش بینی وہ منبع بنی جس نے ان جذبوں اور ان بنیادی آدرشوں کی آبیاری کی جن کے آثار پر ایک مضبوط ملک کو وجود میں آنا چاہیے تھا۔

میں کوئی تاریخ داں ہوں نہ ہی بننا چاہتا ہوں بلکہ مجھے تو اس قسم کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے تھی اس لیے کہ اس سلسلے میں جن لوگوں سے میں نے ملاقاتیں کی ہیں اور احوال سنے ہیں ان کے بارے میں میرے پاس کوئی دستاویز ہے، نہ کتابیں نہ رسائل۔ بدقسمتی سے ابتدا میں کچھ ایسے واقعات ہوئے، جن میں سے دو اہم واقعے تھے ادارے کے صدر دفتر کی کلکتے سے کراچی ہجرت اور ۱۹۷۲ میں زندگی کے بیمے کے کاروبار کو قومی ملکیت میں لیا جانا۔ مجھے تو ادارے کے سال بہ سال بنائے جانے والے میزانیوں کے سوا ایسا کچھ بھی دستیاب نہ تھا جس کی بنیاد پر تحقیق ممکن ہو سکتی۔ ان مشکلات کی وجہ سے مجھے اوّل دن سے کڑیاں ملانے کا کام بھی کرنا پڑا۔ ایک بوائے اسکاوٹ کی طرح تاریخ کے جنگل میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے پڑے۔ مگر میں ان معنوں میں خوش قسمت نکلا کہ ہر ساتھی نے جس سے میں نے اس کھوج میں باتیں کیں، مجھے ایک مشعل دی جس نے دوسرے ساتھی کا پتا بتایا اور دوسرے نے تیسرے کا۔ اس طرح میری اس تلاش کے عمل کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ کبھی تو ایسا لگتا تھا میں کسی ریلے ریس کے مقابلے میں دوڑ رہا ہوں اور ایک جگہ سے حاصل کیا جانے والے مواد دوسرے کو اور دوسرے سے ملنے والا تیسرے کو پہنچ رہا ہے تا آنکہ آخری لکیر پار ہو سکے

مجھ سے بات چیت میں حصہ لینے والے سارے ساتھی اپنے بلند سماجی رتبے کے باوجود بلاشبہ عام آدمی تھے۔ ان سب نے کہانی

کے ٹکڑوں اور حقیقتوں کو اپنے قیاس کے مطابق بیان کیا جب کہ میں نے ان سارے ٹکڑوں کو ہم رشتہ کرنے سے قبل اپنے تجربے اور اپنی معلومات کی بنیاد پر کھا جانچا اور دوسروں سے سنے ہوئے واقعات کی کسوٹی پر کسا۔ اس لیے یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس کتاب میں دی گئی ہر قسم کی تفصیل ہمیشہ اور مکمل سچ کے مترادف ہوگی۔ میں بہر حال اس بات کا یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ میں نے انصاف پسندی کے جذبے کے ساتھ وہی کچھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو کچھ متعلقہ افراد کھلے ذہن اور دماغ کے ساتھ کہنا چاہتے تھے، جن میں سے کچھ نے تو، مجھے ایسا لگا کہ، اس وقت اپنے ضمیر اور اپنے دلوں کو ٹٹولا بھی تھا اور بہت زیادہ صاف گوئی کے عوض اپنے گزرے ہوئے تجربات کی تلخیوں کا مزہ دوبارہ چکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اُن لوگوں نے جو کچھ بیان کیا اُنھیں بعد میں اس پر افسوس بھی نہیں ہوگا۔ یہ سب میں نے بالخصوص اس وقت محسوس کیا جب تقسیمِ ہند کے تجربات بیان کیے جا رہے تھے جن میں اپنی بپتا اور اہلِ خاندان کی ہجرت کے زخم ہرے ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے نہ صرف یہ کہ مال دولت اور جائیداد کا خسارہ برداشت کیا بلکہ قریب ترین اعزّہ کو بھی کھو دیا۔ لہٰذا تقریباً ہر گفتگو کے دوران یہ سوال بار بار اُٹھا کہ تقسیمِ ہند کیا ایک سیاسی مجبوری تھی اور کیا اتنے جانی اور مالی نقصانات اپنے ہدف کے حصول کے لیے جائز اور ضروری تھے؟ میری توقع کے مطابق ان سوالات کے جوابات نہ صرف بہت مختلف تھے بلکہ بعض صورتوں میں خاصے متنازعہ بھی۔ بہر حال یہ سارے جوابات میرے علم میں اضافے کا سبب بنے۔ ان نکتہ ہائے نظر اور ان کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات کے علم سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ ان بدقسمت واقعات کے ذاتی تجربات کے بارے میں، جن سے یہ اور ان کے اقربا گزرے یا قصداً نشانہ بنائے گئے تھے، جو کچھ میں نے پڑھ رکھا تھا، اس کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد ملی۔

میں چاہوں گا کہ اس تصنیف کی اشاعت کو ایک ایسے شخص کے مشاہدے پر محمول کیا جائے جو اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے باعث دنیا کے اس خطے میں ایک طویل عرصہ مقیم رہا تھا اور اس کی زندگی پر اس کے اثرات پڑے۔ پاکستان میں قیام اور ایک مقامی ادارے کے لیے کام کرنا ایک ہیجان خیز تجربہ تھا جس نے نہ صرف میری بلکہ میری شریکِ حیات کی زندگی کو بھی زیادہ دل چسپ اور رنگین بنا دیا۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی سے میرا ربط ۱۹۵۹ء سے شروع ہوا تھا جس کو اب چالیس برس ہو چکے ہیں۔ یہ کمپنی اب اپنی عمر کے اڑسٹھویں برس میں ہے اور مستحکم سے مستحکم تر ہوتی جا رہی ہے۔ جب پاکستان اور ہندوستان اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہے تھے تب میں نے اس کتاب پر کام کرنے کے لیے متعلقہ لوگوں سے ملاقاتیں شروع کی تھیں۔ اس کمپنی اور اس ملک دونوں کے طویل سفر میں جو یہاں تک آ چکا ہے، میں شریک رہا ہوں۔ میں نے ان دونوں کے اچھے اور بُرے وقت بھی دیکھے ہیں اور ان کی کامیابی اور بقا کے لیے کی جانے کوششوں کے سارے مناظر میرے نظر میں محفوظ ہیں۔ تکمیل کی اس راہ میں، جو بلا شبہ کبھی نہ ختم ہونے والا ایک مسلسل عمل ہے، میں نے امیدیں، خواب، سراب، اور ناکامیاں بھی دیکھی ہیں جو کسی بھی انسان کی زندگی میں عام طور پر نظر آتے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ میں محبت اور التفات سے لبریز ایک معروضی ذہن کے زیرِ اثر رہوں۔ جہاں جہاں فیصلے کرنے کے مقام آئے ہیں، میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے انصاف پسندی کی کوشش مدِ نظر رکھی ہے۔ میں نے یہ عہد بھی کیا تھا کہ میں کسی قسم کی تنقید کی پروا کیے بغیر تمام حقائق، وارداتوں، واقعات اور بڑے لوگوں، مردوں، عورتوں سب کے بارے میں، جنھوں نے اس ملک کو عزت اور تکریم کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کے قابل بنایا ہے، کھل کر رائے زنی کروں گا۔

میں نے اس کتاب کو دو ایسی شخصیتوں کے نام کیا ہے جو مختلف وجوہات کی بنا پر میرے دل سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ اپنی شریکِ حیات کے نام جن کے بڑے صبر اور بے دریغ امداد کے بغیر میں ماضی کا اتنا دل چسپ سفر طے نہیں کر سکتا تھا۔ اور جناب روشن علی بھیم جی کے نام جو چار عشروں تک ایسٹرن فیڈرل یونین کے روحِ رواں اور نجات دہندہ کے طور پر رہے۔ انھوں نے اس کمپنی کی تجسیم کی اور اس کو

☆ ''ای ایف یو ساگا'' کے ساتھ دوسری کتاب ''روشن علی بھیم جی کی سوانح حیات''

اپنی یادگار بنا کر چھوڑ گئے ۔ ان کا انتقال اس وقت ہوا جب میں اس کتاب کے لیے تحقیق کا کام تقریباً مکمل کر چکا تھا اور اس کے پہلے صفحے کی تحریر شروع کرنے والا تھا۔ ہم دونوں ساتھی تھے، دوست ہوئے اور پھر بھائی بن گئے ۔ میری بڑی خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں ہی یہ کتاب شائع ہوجاتی، اس لیے کہ اس کی اشاعت اور عوام میں تقسیم سے قبل وہ اس پر صاد کرتے۔ اس منصوبے کے لیے وہ مشعلِ راہ تھے اور جس وقت سے اس کی بنیاد رکھی گئی تھی، ہر مرحلے پر ان کی شرکت رہی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ بقیدِ حیات ہوتے تو جو کچھ میں آنے والے صفحات میں کہنے کی کوشش کی ہے اس پر اپنی مہرِ تصدیق مہر ثبت کر دیتے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی نکتے پر اتفاق نہ بھی کرتے مگر اس کتاب کے بوقلموں پہلوؤں پر من حیث الکل میرے نکتہ نظر سے ضرور اتفاق کرتے۔ اس منصوبے کی ابتدا ہونے سے پہلے ہی ہم دوستوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر کوئی تنازعاتی سوالات اُٹھے تو ہم یہ دیکھنے کے لیے کہ ان میں سچ کیا ہے، آپس میں مشورہ ضرور کریں گے مگر میں اپنے فیصلے کرنے میں مختار ہوں گا اس لیے کہ ان کے الفاظ میں ای ایف یو کا ادارہ پاکستان کے عوام کی ملکیت ہے باوجود یکہ یہ ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔ ان کی معیت کی وجہ سے اس ساری جد و جہد کے دوران میں نے خود کو بہت کم ہی کبھی اکیلا محسوس کیا ورنہ زیادہ تر دوسرا تھ کا احساس رہا۔ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

آخر میں مجھ پر ان کشادہ ذہن لوگوں کے لیے تہِ دل سے شکریہ واجب ہے جنھوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ اور تکلف کے اپنا راستہ تلاش کرنے میں میری مدد کی۔ یہ لوگ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتے تھے، کمپنی کے سابق اور موجودہ ملازمین جن کے ماضی کی تاریخ کی مجھے تلاش تھی، کمپنی کے ان اعلیٰ افسران کے اہلِ خانہ جو اگرچہ ہمارے درمیان نہیں مگر ہمارے دل ان کی خوب صورت یادوں سے اب بھی معمور ہیں، سابق اعلیٰ سرکاری افسران، معزز صنعتکار، اشرافیہ، سیاست داں، اور پرانے وقتوں کے دوست وغیرہ۔ ان لوگون کی مدد کے بغیر اس کمپنی کے، جو کہ اب ایک بڑا پاکستانی ادارہ بن چکی ہے، مختلف النوع پہلوؤں کی گتھیوں کو سلجھانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔

# تشکّر

اگر چہ میں عام الفاظ میں، پاکستان، ہندوستان، لندن اور دبئی میں مقیم تمام خواتین وحضرات کا اپنے دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کر چکا ہوں جنھوں نے بہت کشادہ دلی سے اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کرنے میں میری مدد فرمائی جس کے بغیر میری یہ دونوں کتابیں مکمل نہیں ہوسکتی تھیں پھر بھی میرا خیال ہے کہ میں ان لوگوں کا الگ سے شکریہ ادا کروں جنھوں نے کئی قدم آگے بڑھ کر میری مدد کی۔

ان تین برسوں کے دوران جب میں ان کتابوں کی تحریر میں مصروف رہا، میں مندرجہ بالا جگہوں پر خود گیا اور ظاہر ہے کہ پاکستان برابر جاتا رہا ہوں۔ میں نے درجنوں حضرات سے بات چیت کی جنھوں نے ان شخصیتوں کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات اور اپنی معلومات کی بنیاد پر کوائف مہیا کیے جن کی مدد سے میں نے ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے۔

میرا خصوصی شکریہ ان کے لیے جنھوں نے ان لوگوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کے لیے ملاقات کا انتظام کیا، جن سے میں ذاتی طور پر واقف نہ تھا یا پھر ان کے موجودہ پتے مجھے معلوم نہ تھے، میں بے حد شکر گزار ہوں کے ایف حیدر صاحب کے فرزند مصطفیٰ حیدر کا جنھوں نے میری بہت مدد فرمائی۔ اس طرح سے میں ای ایف یو کے کچھ افسران کا شکر گزار ہوں جنھوں نے بہت سرعت کے ساتھ مجھے وہ کچھ معلومات فراہم کیں جن کی مجھے تلاش تھی۔ جناب مہدی امام، جناب ڈی ایچ سدھوا، جناب کھتری حسین، اور جناب ایس اے رشید۔ میں ای ایف یو کے EDP Department کے سربراہ جناب سید احمد حق اور ان کے بہت ہی لائق ماتحت جناب عبدالقادر کا شکر گزار ہوں جنھوں نے کتابوں کے آخری مسودے کو چھاپے خانے تک پہنچانے میں جو تکنیکی امداد ضروری تھی، وہ فراہم کی۔

میرے ہندوستان کے سفر میں جو میں نے معلومات اکٹھا کرنے کے لیے کیے تھے، بالخصوص جن دو حضرات نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر میری امداد کی وہ تھے اے سی مکھر جی صاحب سابق چیئرمین و مینجنگ ڈائریکٹر، نیو انڈیا انشورنس کمپنی، مسٹر بھیم جی کے دیرینہ دوست اور ہندوستان میں MunichRe کے مشیر ایم آر مہتا۔

میرا خصوصی تشکر بنگلہ دیش کی ایک بڑی انشورنس کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر جناب شمس العالم کے لیے بھی ہے جو متحد پاکستان کے زمانے میں PIC کے مشہور افسر تھے۔ انھوں نے پاکستان کی انشورنس کی تاریخ سے وابستہ میری یادوں کو تازہ کرنے میں میری مدد کی۔

برطانیہ میں مقیم مسٹر بھیم جی کے دیرینہ دوست دو سابق ڈائریکٹر ڈیوڈ ڈولن صاحب اور جان پال بھی میری شکر گزاری کے مستحق ہیں اس لیے کہ انھوں نے بہت پرانے واقعات کو قلم بند کرنے میں میرے مدد فرمائی۔

ایک اور خصوصی تشکر MunichRe Australia کے مینجنگ ڈائریکٹر ایلن سی ڈریک کے لطفِ خاص کے لیے جنھوں نے

تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل مسودے کو نہ صرف غور سے پڑھا بلکہ پڑھ کر انگریزی قواعد کی تصحیح میں بھی میرے بہت مدد کی۔

شہریار جلیس، EFU General کے تعلقاتِ عامّہ شعبے کے نائب صدر کا تذکرہ اور شکرانہ اس لیے از حد ضروری ہے کہ ان کی بے لوث مدد کے بغیر اتنے بڑے منصوبے کی راہ میں، آخری سطر کے لکھے جانے تک، آنے والی اڑچنوں سے، جو ہر لحظہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں، بچ کر نکلنا میرے بس کا نہیں تھا۔ ان کی امداد کتاب کی شروعات سے اشاعت کے بعد میرے ہاتھ میں آنے تک اسی خندہ پیشانی سے رہی جس کے لیے وہ صحافتی حلقوں میں مقبول ہیں۔

میں شکر گزار ہوں اپنے دیرینہ دوست حمید سجالی کا بھی جنھوں نے اس منصوبے کے آخری لمحات میں تکنیکی الجھنوں کو حل کر کے میرا کام آسان کیا۔

آخر میں معروف صحافی محمد میاں صاحب کا اور جناب سیف الدین زومکا والا کا شکرانہ واجب ٹھہرا جنھوں نے نہ صرف مسودے کی ہر سطر کا بہ غائر مطالعہ کیا بلکہ میری ہمت افزائی بھی کی اور بہت سے قیمتی مشورے بھی دیے۔ سیف الدین زومکا والا کا میں خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ اپنے دیرینہ رفیق جناب روشن علی بھیم جی کی وفات کے بعد انھوں نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔

آخر آخر میں ان تمام بے لوث اور انتھک صحافیوں کے لیے خلوصِ بے پایاں جو مملکتِ پاکستان کے قیام سے آج تک ملک کی بہتر خدمت کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ حسنِ اتفاق ہی تھا جب میں نے اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کرنا شروع کیا تو عین اس زمانے میں پاکستان کے پچاس برس ہونے والے تھے۔ اس موقعے پر جتنا کچھ مواد ان صحافیوں کے طفیل مجھے نصیب ہوا وہ شاید میں کبھی بھی جمع نہ کر سکتا۔ گویا بیٹھے بٹھائے ایک سونے کی کان میرے ہاتھ آ گئی تھی جس سے میں نے خوب استفادہ کیا۔ میں شرمندہ ہوں کہ ان سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا نہیں کر سکتا اور امید کرتا ہوں وہ میری مشکلات کا اندازہ کریں گے اور میری خطا سے درگزر کریں گے۔

# تعارف

اس کتاب کے منصوبے پر میں ای ایف یو میں اپنے قریب ترین دوستوں سے جب بھی بات کرتا جناب روشن علی بھیم جی بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ قاری کو برطانوی راج کے ہندوستان میں بیسویں صدی کے پہلے نصف میں مسلمانوں کو درپیش سیاسی، تجارتی، نفسیاتی میدانوں میں مسائل کے بارے بتانا کتنا ضروری ہوگا۔ ہم دونوں نے اس بات پر ہمیشہ اتفاق کیا کہ ای ایف یو کی تاریخ میں صرف اعداد وشمار اور کمپنی کے بارے میں حقائق، اور بالواسطہ یا بلا واسطہ کمپنی سے متعلق اور اس کے ایک دو درجن افراد کے کمپنی کی ترقی میں تعاون اور ان کے حالاتِ زندگی اور ملازمت کے دوران کام کے بارے میں، منفی یا مثبت معلومات مہیا کر دینا ہی کافی نہ ہوگا۔ ہم نے سوچا کہ جو کوئی بھی اس کتاب کا قاری ہو، خواہ وہ ای ایف یو کے موجودہ کارکنان ہوں، ان کے اہلِ خانہ، دل چسپی رکھنے والے دوست، پاکستان یا اس سے باہر کے انشورنس کے شعبے سے دل چسپی رکھنے والے لوگ، امکان ہے کہ ان سب کو برصغیر ہند و پاک کی تاریخ کے بارے اتنا علم نہیں ہوگا جتنا کہ ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ کچھ لوگوں کو چھوڑ کر، یہ مفروضہ، ہر عمر، صنعت، طبقے اور تعلیمی پس منظر کے لوگوں کے حوالے سے قائم کیا گیا تھا۔

لہٰذا ہم نے طے کیا کہ میں مختصراً ان سیاسی اور تاریخی واقعات کا ایک ایسا خاکہ تیار کروں جو بالآخر برطانوی ہند کی تقسیم پر منتج ہوئے، جس پر تاریخ دانوں کی اکثریت متفق ہو، خواہ وہ پاکستان کے ہوں، ہندوستان کے، یا کسی اور ملک کے۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے وہ قاری جو اپنے کاروباری پس منظر یا اس خطے کے تاریخی پس منظر میں ذاتی دل چسپی رکھنے کی وجہ ان سب سے تبدیلیوں سے واقف ہوں، درگزر کریں گے۔ اگر وہ چاہیں تو اس باب سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں یا پھر ایک جرمن کے پیش کیے ہوئے خیالات سے اتفاق یا اختلاف کرنے کی غرض سے اس کو پڑھیں، جس نے ۱۹۴۵ء میں اپنے ملک کی تباہی کے تجربات کی روشنی میں ایک نئی شروعات اور اس میں پیش آنے والی الجھنوں پر کچھ اپنے مفروضے بنا رکھے ہیں۔

اس وقت کے سیاسی اور تاریخی تناظر میں جب ایسٹرن فیڈرل یونین بنائی جا رہی تھی، اس کا قیام ایک منطقی اور ناقابلِ فراموش ضرورت تھی۔ جن لوگوں نے اس ادارے کے قیام میں عملی حصہ لیا یا اس خیال کے مددگار تھے، وہ اس وقت کے سیاسی پیش منظر کے ہندوستانی مسلمانوں کی سربرآوردہ شخصیتوں، یعنی مسلم لیگ کے اہم ارکان میں سے تھے۔ غلام محمد، عبدالرحمٰن صدیقی، اصفہانی خاندان، راجا صاحب محمود آباد، آغا خان، اور نظام حیدرآباد جیسے لوگ تھے جن کے نام پردۂ ذہن پر فوراً اُبھرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ بھلا ایسے سربرآوردہ لوگ اس نتیجے پر کیوں پہنچے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ صرف فائدہ مند ہی نہیں ضروری بھی ہے کہ ان کی تجارتی سرگرمیاں بڑھیں اور یہ لوگ بینک اور انشورنس کے کاروبار میں بھی شامل ہو جائیں۔

روشن علی بھیم جی جیسے انسان کے نزدیک ای ایف یو پر لکھے جانے والی کوئی کتاب اس وقت تک نامکمل ہوگی جب تک کہ ۱۹۳۲ء

میں اس ادارے کے قیام سے قبل کے زمانے اور اس وقت کے سیاسی پیش منظر پر خاطر خواہ روشنی نہ ڈالی جائے۔ بھیم جی صاحب نے پورے عرصۂ حیات میں سیاست میں صرف گہری دل چسپی ہی نہیں لی، عملی سیاست میں حصہ بھی لیتے رہے۔ ایک نوجوان کی حیثیت سے انھوں نے آل انڈیا کانگریس کے حریت پسند سپاہی کے طور پر کام کیا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں انھوں نے ایسے شخص کا کردار ادا کیا جو پسِ پردہ رہ کر کام کرتا ہے۔ اسی سبب سے ان کو بادشاہ گر بھی کہا گیا ہے۔

برصغیر ہند و پاک کی تاریخ اور موجودہ سیاست میں میری دل چسپیاں انھیں (جناب بھیم جی) کے زیرِ اثر تھیں، دراصل انھوں نے ہی مجھے اس طرف راغب کیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں نہ دانشور ہوں نہ ہی تاریخ کا طالب علم، اس کے باوجود بھی اس موضوع نے مجھے ہمیشہ مسحور کیا ہے۔ میں جب پاکستان آیا تو میں نے اس خطے کے تاریخی تناظر پر نظر ڈالنے کی شعوری کوشش کی۔ جناب بھیم جی سے ملاقات کے بعد، جو خود بھی سیاسی شعور رکھتے تھے، میری مشکلات کچھ آسان ہو گئیں۔ انھوں نے مجھے اس خطے کے لوگوں کے بارے میں معلومات بھی مہیا کیں اور اس علاقے کی زبان سے بھی آشنا کیا۔ زبان سے میری مراد وہ زبان (الفاظ اور حروف نہیں)، جو آپس میں بولی جاتی ہے، وہ زبان جو یہاں کے لوگوں کے دل اور دماغ بولتے ہیں، جس کے حروف و الفاظ کو نہ دیکھا اور نہ سنا جا سکتا ہے۔

جب ہم اس کتاب کی تحریر کے بارے میں تبادلۂ خیالات کے مراحل سے گزر رہے تھے، ہم اور ہمارے دوست، دونوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس کتاب کے بہت سارے قاری اس دور کی تاریخ کو شاید فضول ہی سمجھیں گے۔ ہم نے سوچا کہ گزرے عشروں بلکہ صدیوں کی طرف پلٹ کر دیکھنے سے ہمارے موجودہ اور مستقبل کے مسائل کے لیے کیا حاصل ہوگا۔ بہت سے لوگ تو ماضی کے واقعات اور ان سے منسلک اعداد و شمار کے نام سے ہی بدک جاتے ہیں۔ تاریخ کی بات آتے ہی لوگوں کا ذہن اسکول کے دنوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی طرف منعطف ہو جاتا ہے جن میں عام طور پر جنگ، صلح اور پھر جنگ ہی کے تذکرے ہوتے ہیں۔ جنگیں، لوگ جن سے اکتا چکے ہیں، بلکہ ان کے نام ہی سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں اس لیے کہ خواہ ان کا ذمہ دار کوئی بھی ہو نقصان تو صرف ہمارا، یعنی عوام الناس ہی کا ہوتا ہے اور صاحبانِ اقتدار تو ہمیشہ محفوظ پناہ گاہوں میں نہ صرف عیش کرتے ہیں بلکہ وہ تو ہمیشہ جیتنے والے ہی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

سچ پوچھا جائے تو وہ تاریخ جو ہم لوگوں کو اسکول میں پڑھائی جاتی ہے، اس میں ماضی میں گزرنے والے واقعات کی اصلیت چھپائی جاتی ہے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اگرچہ ہمیں اس بات کا پورا علم ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے اجداد نے کس قسم کی زندگی بسر کی ہے اور ان کے خیالات کیا تھے، اس کے باوجود ہمارا وجود ہمیں ورثے میں ہی ملتا ہے اور بیش تر ہم اپنے اجداد ہی کے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ کسی دانشور نے تاریخ کو ''بڑے لوگوں کے طویل ہوتے ہوئے سائے'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ساری بڑی تبدیلیاں اور کامیابیاں ان صاحبانِ عقل و فہم ہی کی دین ہوتی ہیں جو وسیع قلب و نظر کے مالک ہوتے ہیں۔ جی ہاں، جب ہم تاریخ کو بے مقصد جنگوں کے سلسلے، فتوحات اور شکستوں سے پُر سمجھتے ہیں تو کبھی کبھی ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تاریخی شخصیات ہی کے خیالات، سازشوں، منصوبوں، خوابوں اور تصورات کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ کے ان نام نہاد واقعات کے پس منظر میں مشہور شخصیات، بادشاہ، جرنیل، روحانی قائدین وغیرہ کے احوالِ زندگی بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیزر، سکندر، اکبر، حضرت محمدؐ، حضرت موسیٰؑ، گاندھی اور جناح وغیرہ۔ یہ ان لوگوں کے کارنامے ہی تھے جنھوں نے ملکوں، قوموں اور لوگوں کی تقدیر کے فیصلے کیے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس برصغیر کی تاریخ میں بھی کچھ دل چسپی لینی چاہیے، ہمیں ان بڑے لوگوں کی طرف غور سے دیکھنا چاہیے جو اس وقت، پچاس برس یا سو برس بعد کے حالات پر اثر انداز ہوں گے جس کو ہم ''تاریخ'' کہتے ہیں۔ ہمیں کم از کم ان پردوں کے پیچھے نظر ڈالنی چاہیے جو آج کے لمحۂ موجود کو ماضی کے گزرے واقعات سے الگ کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ وہی لوگ تاریخ کو ناپسند کرتے ہیں، جنھوں نے بدقسمتی سے غلط استاد کا انتخاب کیا ہوتا ہے۔ میری مراد ہے، واقعتاً

غلط استاد سے، ایسے جو اپنے شاگردوں کو تاریخ کا ایسا رُخ دکھاتے ہیں گویا جو کچھ بھی ہوا بس وہ اتفاقی یا حادثاتی سلسلہ تھا۔ یعنی تاریخ نہ ہوئی بے کار یا اونچے اونچے خیالات کا مجموعہ، تصاویر کی ایک کتاب جو قبیلوں ملکوں کی سربراہی کرنے والی سو دو سو، ہزار دو ہزار نام نہاد بڑی بڑی شخصیات کے تذکرے، ان کی کامیابیوں، ناکامیوں کے نقش و نگار سے مزین ہو۔ کیا ایسے استاد کی شاگردی بدقسمتی نہیں جو حالات اور واقعات کو اصل کیفیت میں بیان بھی نہ کر سکے، جو آپ کی محبوب یا اہم شخصیات کا صحیح تاریخی تناظر بھی پیش نہ کر سکے؟

اگر چہ یہ ضروری نہیں کہ مستقبل کے پچاس برسوں میں پڑھانے یا بیان کی جانے والی تاریخ مخصوص مملکتوں کے حالات پر توجہ مرکوز کرے (مجھے یقین ہے کہ تاریخ کو وسیع علاقوں، براعظموں وغیرہ پر نظر ڈالنی ہوگی) مگر میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ جنوبی ایشیا کے اس علاقے، یعنی بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں پچھلے ایک سو پچاس برسوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ ہمیں بہ غور دیکھنا چاہیے کہ برصغیر میں برطانوی راج سے آزادی کس طرح حاصل ہوئی، کیسے اور کیوں پاکستان کا قیام ایک حقیقت بنا؟ یہ ایک جد و جہد کا عمل تھا جس سے اپنی نوعیت کا ایک منفرد نتیجہ برآمد ہوا۔ لیجیے ایک قوم کی پیدائش ہوئی، ایک ملک وجود میں آ گیا ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء سے قبل دنیا کے نقشے پر جس کا کوئی تذکرہ بھی نہ تھا، ایک قوم جس کی سرحدوں کا تعین اس وقت تک نہیں ہوا جب تک کہ ایک شخص جس نے برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی کے حکم پر، از کار رفتہ نقشوں، آبادی کے پرانے اعداد و شمار اور شراب کی بوتلوں کی مدد سے پاکستان تخلیق کر دیا۔ جی ہاں وہی Sir Cyril Radcliffe جس کو اس کے آکسفرڈ کے دوست 'The Squit' کے نام سے پکارتے تھے، جس کا نام تاریخ کے صفحات پر مرتسم ہو گیا۔ اس نے نقشوں میں ایسی تبدیلیاں کر کے پاکستان بنایا کہ اس کے بنتے ہی اس پر بحث و تمحیص شروع ہو جائے اور طرفین آپس کی پیکار میں مشغول ہو جائیں۔ سرحدیں اس طرح کھینچی گئیں کہ مصنوعی لکیروں کے دونوں جانب رہنے والوں کی قسمت کے یک طرفہ فیصلے ہو گئے۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء سے ایک دن قبل جب برصغیر پر برطانوی پرچم یونین جیک آخری بار اُتارا جانے والا تھا، ریڈکلف نے اپنے پوتے کو لکھا، ''مجھے یقین ہے کہ تم چاہو گے کہ تمھیں ہندوستان سے ایسا خط لکھا جائے جس کے لفافے پر برطانوی تاج بنا ہوا ہو۔ کل شام کے بعد کسی کو ایسے لفافے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اور ایک سو پچاس برس بعد برطانوی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یونین جیک کے بعد کون سا پرچم بلند ہوگا، مجھے ابھی علم نہیں کہ اس کے بیچوں بیچ ایک گھومتا ہوا پہیہ ہوگا یا مکڑی کا جالا۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی بنا پر ہندوستان کا کوئی بھی آدمی مجھے پسند نہیں کرے گا اور مجھ سے شاکی اندازاً آٹھ کروڑ لوگ میری تلاش میں ہوں گے۔ میں ان کے ہتھے چڑھنا نہیں چاہتا۔''

انسان کے کیے ہوئے فیصلے کتنے ظالمانہ، غیر منصفانہ اور دور رس ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود جب ہم تاریخ کے صفحات میں جھانکتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ انسان کی اس طرح کی حرکات قوموں کے لیے زندگی اور موت کا سبب بنتی ہیں۔ یہی نکتہ ہے جو پاکستان کی مختصر سی تاریخ کو دل چسپ اور ہیجان خیز بناتا ہے۔

پہلا باب

# آزادی کا سفر اور مسلمان

کیا برطانوی ہند کی تقسیم ناگزیر تھی؟ کیا فرقہ وارانہ مسائل اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ آخر کار مسلم اقلیت کے لیے یہ جینے مرنے کا مسئلہ بن گیا تھا، کیا واقعی یہ سوال ہندوستان کی آبادی کے ایک تہائی مسلمانوں کے لیے موت اور زندگی کا سوال تھا؟

اور وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ اس عظیم برصغیر پر بسنے والوں کے لیے خوشی کا موقع تھا کہ ان کی طویل جدو جہد اپنے آخری مرحلے میں تھی اور طویل انتظار کے بعد ہندوستان کی آزادی کا حصول قریب تھا۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک آج بھی یہ مسئلہ اہم ہے اور تقسیمِ ہند کے بعد سرحدوں کے دونوں جانب کے سیاست دانوں اور مؤرخین کے درمیان اس موضوع پر بحث اب بھی وسیع پیمانے پر جاری ہے۔

جب سے میں نے اس برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھا ہے مختلف طبقۂ خیال اور درجۂ سماج کے لوگوں سے اس جذباتی اور بے حد نازک مسئلے پر تبادلۂ خیالات کا موقع ملا ہے اور ہماری زیادہ تر گفتگو متنازعہ اور جذباتی رہی ہے۔ ہم کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ کم از کم خطِ تقسیمِ ہند کے اس جانب سب ایک نکتے پر متفق رہے ہیں اور وہ یہ کہ اگر تقسیم نہ ہوتی تو آزادی کے بعد ہندو قومیت غالب آجاتی اور اس کے اثرات یک طرفہ ہوتے۔ مزید یہ کہ باوجود اپنے تمام تر نیک ارادوں کے نہرو اور گاندھی دونوں ہندوستان کے سیاسی دھارے میں ہندو قومیت اور اس کی جارحانہ عصبیت کے نفوذ کو روک نہ سکتے۔

اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہندوستان کے مسلمان دوسرے درجے کے شہری کا رُتبہ پاتے اور تنگ ذہن ہندوؤں کا نشانہ بنے رہتے۔ ہندوؤں کی قومی اکثریت میں مسلمانوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق حصہ نہ مل پاتا۔ آج کے ہندوستان کے غائر مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوجائے گا کہ اہم حکومتی اداروں اور ان سے منسلک اداروں میں، اِکا دُکا کے سوا، مسلمان کس درجے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ جب اس باب کو لکھنا شروع کیا، اس وقت میں امریکا میں تھا اور ۱۹ر مارچ ۱۹۹۹ء کو نیویارک ٹائمز میں ایک خبر چھپی تھی جس کا عنوان تھا ''ہندوستان میں نئے مذہبی فسادات میں ۱۵۷ عیسائیوں کے گھر جلا دیے گئے۔'' خبر کی تفصیل میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیوں کے خلاف تشدد اس معاشرے میں عام بات ہے اور جب سے ہندو قومیت کا پرچار کرنے والی بھارتیہ جنتا پارٹی حکومتی اتحاد کا حصہ بنی ہے، اس نوع کے فسادات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ لکھنے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہندوستانیوں کی اکثریت یا اس کے سیاسی لیڈر مذہبی اقلیتوں کے خلاف ہونے والے تشدد یا قتل کی سرپرستی کرتے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے سارے لیڈر اس قسم کے تشدد سے اتفاق کرتے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج پچاس برس گزرنے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے کہ اُس وقت مسلمانوں کا استدلال کہ ہندو اکثریت کی حکومت میں ان کا تحفظ غیر یقینی ہوگا، غلط نہیں تھا۔ آج جو کچھ ہندوستان کی عیسائی اقلیت کے

ساتھ ہو رہا ہے بار ہا وہی ہندوستان میں آباد مسلم اقلیت کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ مسجدوں کو آگ لگانا اور مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل اِکا دُکا واقعات نہیں تھے، یہ سب ہندوستان کی آزادی کے بعد سے مسلسل ہوتا آ رہا ہے۔

یہ سب کچھ لکھ کر بجھتی ہوئی آگ پر نفت پاشی کرنا ہرگز میرا مقصد نہیں۔ اس کے برعکس میں پچھلے چالیس برسوں میں ہندوستان کے بے شمار باسیوں سے ملا ہوں جو اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کی اسی نوع کی شرمساری سے مذمت کرتے ہیں جس طرح کہ سرحد پار کے لوگ اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔

پھر بھی میرا خیال ہے کہ جب ہمیں اس سوال کا جواب ڈھونڈنا ہو کہ اس وقت کے معروضی حالات میں کیا ہندوستان کا بٹوارا ہی واحد حل تھا تو اس قسم کے تشدد اور اس کی مسلسل وارداتوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ ایک غیر جانبدار غیر ملکی کی حیثیت سے میں ذاتی طور پر کس نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ اس بحث کے بعد ضرور بیان کروں گا۔ مگر اس مقام پر پہنچنے سے قبل ہمیں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے ابتدائی دنوں کے زمانے میں جانا ہوگا تا کہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ یہ سب کس طرح شروع ہوا۔

تحریک کے ابتدائی دنوں میں آل انڈیا کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ دونوں نے حصولِ آزادی کا مقدس سفر ایک ساتھ شروع کیا تھا۔ کم از کم دکھائی تو ایسا ہی دیتا ہے۔ یہ کیفیت ایک قلیل عرصے تک ہی رہی۔ اس کے بعد ان کے راستے مختلف ہوتے گئے اور آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے ساتھ منافرت کے رویے میں اضافہ ہوتا گیا۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ برصغیر کی تقسیم برطانوی راج کا اصل ہدف تھا جو انھوں نے سلطنتِ تاجِ برطانیہ کی تباہی کے انتقام کی صورت میں لیا جو انگریزوں کی مشہور پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے عین مطابق نظر آتا ہے۔

خواہ وہ ہندوستان کے ہوں یا پاکستان کے، سر برآوردہ تاریخ دان اس بات پر متفق ہیں کہ یہ حالات زیادہ دن نہیں رہ سکیں گے۔ اس لیے کہ ہندو مسلم تنازعہ آج کا نہیں، یہ اس وقت سے چل رہا ہے جب اٹھارہویں صدی میں برطانیہ نے ہندوستان فتح کر لیا تھا۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ کسی بادشاہ کے حکم سے نہیں بلکہ ایک انگلستان نژاد تجارتی ادارے کے ہاتھوں ہوا۔ بے شک، جس کو تجارت کرنے کے اختیارات برطانیہ کے حکمران ہی نے دیے تھے۔ دوسرے الفاظ میں پانچ ملین کی آبادی والے ملک نے ایک پورے برِصغیر پر قبضہ کر لیا جس کی آبادی ایک سو پچاس ملین کے لگ بھگ تھی۔

تو کیا تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی تھی؟ کیا وہی کچھ نہیں ہوا جو اس وقت ہوا تھا جب شمال سے آنے والے حملہ آوروں نے ہندوستان پر مغلوں کی حکومت قائم کی اور سات سو برس تک فارسی دفتری زبان کے طور پر رائج رہی، تو کیا نچلے طبقے کے ہندو مشرف بہ اسلام نہیں کر لیے گئے؟ اور کیا شہنشاہ اورنگزیب، جس کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا، ہندو مسلم آویزش کا ذمہ دار نہیں تھا جس کے ذریعے مغل حکومت کو اسلام کا لبادہ پہنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ بہت سارے مسلمان تاریخ دانوں نے اورنگزیب کی ان کوششوں کی تعریف کی ہے جن کے نتیجے میں اس کی مسلمان رعایا کو علیحدہ نظریاتی اور مذہبی تشخص حاصل ہوا۔ بدقسمتی ہی کہیے کہ اس کے انتقال کے بعد سے ہی ان اہم عہدوں پر سے مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور مسلمانوں کا اثر تیزی سے ختم ہونا شروع ہو گیا۔ یہ صورتِ حال اس حد تک بگڑتی نظر آنے لگی کہ ہندوستان کے ایک نامور صوفی نے افغانستان کے تاجدار کو مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ایک خط بھیجا تھا جس میں اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ:

''المختصر، مسلمان بہت ناگفتہ بہ حالت میں ہیں۔ حکومت کے سارے ادارے ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں اس لیے کہ وہ ہی مستعد اور صلاحیت والے ہیں۔ دولت اور خوشحالی ان کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گئی جب کے ہم مسلمانوں کے حصے میں سوائے عسرت اور بدحالی کے کچھ نہیں۔''

جس سرعت سے مغلوں کی حکومت کا زوال ہوا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ تہذیبی اور عمرانی طاقت کے طور پر سات سو برس تک

ہندوستان پر اسلام کا غلبہ رہا۔ فارسی دربار کی زبان رہی اور جیسا کہ سر ولیم ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں لکھا، ''سارے اہم عہدے مسلمانوں کے قبضے میں ہوگئے تھے۔ ہندوؤں نے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں پر شکریے کے ساتھ اکتفا کی تھی۔ مگر اورنگزیب کے انتقال کے بعد مسلمانوں کی قوت میں کمی ہونے لگی۔ سرکاری دفاتر سے فارسی زبان کو دیس نکالا ملا اور اس طرح انتظامی عہدوں پر مسلمانوں کا اثر ختم ہوگیا۔

۱۸۵۷ء کی ''بغاوت'' کے نتیجے میں مسلمانوں کو سب سے بڑا دھچکا پہنچا۔ مسلمان قربانی کا بکرا بنا دیے گئے۔ برطانیہ نے تحریکِ آزادی کو ''غدر'' کا نام دیا جس کے لیے عام طور پر مسلمان ہی ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔ انگریز حکمرانوں کے نزدیک اس موقعے پر خون بہانے سے مسلمان کم زور ہوجائیں گے، جو، اُن کے خیال کے مطابق دہلی اور اودھ پر اُن کی حکمرانی کے سخت مخالف تھے اور یہ بہترین موقع تھا کہ ان کو اس قدر کم زور کر دیا جائے کہ وہ پھر سر نہ اُٹھا سکیں۔ دہلی اور اس کے اطراف ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے مارے جانے کے علاوہ، جن میں کئی مغل شہزادے بھی شامل تھے، مسلمانوں کو معاشی طور پر کم زور کرنے کی غرض سے ان کو ان کی جائیداد سے بھی محروم کر دیا گیا۔ فوج میں بھی مسلمانوں کی بھرتی ممنوع کر دی گئی، اور جائیداد کے علاوہ جو ان کا بڑا ذریعۂ آمدنی تھا، وہ بھی مسدود کر دیا گیا۔ ایک سو سال کے عرصے کے دوران پوری کایا پلٹ چکی تھی۔ انگریزوں کی جانب سے اچھی ملازمتیں، مسلمانوں سے چھینی ہوئی جائیداد اور رسوخ کی عنایات کے صلے میں ہندو انگریزوں کے یارانِ وفادار ہو چکے تھے جب کہ مسلمانوں کو نچلے طبقے کے افراد کا کردار ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ ''بغاوت'' کے جرم کی سزا کے طور پر مسلمانوں کے تعلیمی ادارے یا تو ضبط، یا بند کر دیے گئے تھے جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلیمی خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔

## ہندوؤں کی نشاۃِ ثانیہ

ایک اور وجہ تھی جس نے اس سلسلے میں خرابی پیدا کی۔ ۱۸۵۷ء کے بدقسمت واقعات سے بہت پہلے مغل شہزادوں نے قدامت پسند مذہبی رہنماؤں کو قیادت کے فرائض سونپ دیے تھے۔ ان لوگوں نے شدت سے نہ صرف مغربی تہذیب کو بلکہ مغربی زبانوں، حتیٰ کہ سائنس تک کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ملک پر سے مغلوں کے اثرات ختم ہو جانے کے بعد ہندوؤں نے جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے برعکس تھا۔ اپنی مشہورِ زمانہ کتاب Discovery of India میں جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کا شاید ادراک نہیں تھا کہ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد، اس کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا جس کا اس سے پہلے کے حملہ آوروں یا سیاسی اور معاشی ماحول سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان پہلے بھی فتح ہوا تھا مگر فرق یہ تھا کہ حملہ آوروں نے اس کی سرحدوں کے اندر ہی اپنے گھر بنالیا تھا اور یہیں کے ہو رہے تھے۔ ہندوستان نے نہ کبھی اپنے آزادی گنوائی نہ کبھی غلام بنا۔ یعنی اس کو ایسے حالات میں گھسیٹا نہیں گیا، جن کے معاشی اور سیاسی مراکزِ ثقل اس کی دھرتی سے باہر رہے ہوں۔ نہ ایسے حکمراں طبقے کے زیرِ اثر رہا جو اپنی اصلیت اور کردار میں ہمیشہ کے لیے غیر ملکی رہے ہوں۔

ماضی کے ہر حکمران طبقے نے، خواہ وہ باہر سے آیا ہو یا مقامی رہا ہو، ہندوستان کی عمرانی اور معاشی زندگی کے ڈھانچے کو من و عن قبول کر لیا تھا اور اسی کے سانچے میں ڈھل جانے کی کوشش کی تھی۔ سب نے خود کو ''ہندوستانیا'' لیا تھا اور ان کی جڑیں اسی زمیں سے سیراب ہو رہی تھیں۔ نئے حاکم بالکل مختلف تھے کہ ان کے اڈے کہیں اور تھے، ان میں اور عام ہندوستانی میں ایک وسیع اور نا قابلِ عبور خلیج حائل تھی۔ وہ روایات میں، اندازِ نظر میں، آمدنی میں اور رہن سہن میں بالکل مختلف تھے۔

مغربی طاقت کی ہندوستان میں آمد سے یہاں آزاد خیال لوگوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو یورپ کو اپنا فکری و عقلی گھر سمجھتا تھا۔ یہ لوگ اس معاشرے کی بیشتر کیفیات پر معترض ہوتے اور ان کے نزدیک نئے حالات میں جدیدیت اور ہم آہنگی کے لیے ہندوستان کی تہذیب کو مشرق اور مغرب کا ایک معتدل آمیزہ ہونا چاہیے۔ اس نوعیت کی یورپ کی نقالی کے خلاف ۱۸۷۰ء میں ایک نئی تحریک نے سر اُبھارا جو صدی کے آخری دنوں تک خاصا زور پکڑ گئی، جس کو بعد میں ہندو نشاۃِ ثانیہ یا ہندومت کی بازیافت کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کے نزدیک

یورپی تہذیب مادّی اور بے روح تھی جب کہ ہندومت کے داعی مذہبی رجحانات رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے شروع کے ایک یورپی ہمعصر کے مطابق، ''یہ تحریک دراصل ہندوستانی قومیت کو ہندو قومیت میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے، لہٰذا مسلمان اور بودھ مت کے پیرو اس میں اس وقت تک شامل نہیں ہوں گے جب تک کہ ان کو ضروری تحفظات فراہم نہ کر دیے جائیں۔'' نئی قومیت اور ہندومت کی بازیافت کے سرخیل سوامی دیانند سارس وتی سمجھے جاتے تھے۔ سوامی وویکانند ہندو تہذیب کی برتری کے مبلغ اور اصلاحی تحریک کے علمبردار کے طور پر اُبھرے جنھوں نے نہ صرف امریکا میں بلکہ ساری دنیا میں بڑی شہرت پائی اور تقریباً تین برس تک ان کا قیام مغربی ممالک میں رہا جہاں انھوں نے خطبے بھی دیے اور اپنی تحریک کے مراکز بھی قائم کیے۔ میرے نزدیک ہندومت کے پرچارکوں میں سوامی وویکانند سب سے سربرآوردہ کردار تھے جو ہندومت کی بازیافت پر اثر انداز ہوئے۔ سوامی جی ماضی پسندی اور ہندوستان کے ورثے پر فخر کرنے کے باوجود جدید ذہن کے مالک تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہندوستان کے ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے لکھا، ''میرا ایمان ہے کہ کوئی بھی فرد یا قوم دوسری اقوام سے بالکل الگ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی اور جب بھی برخود غلط عظمت، پالیسی، یا پاکیزگی کے نام پر ایسی کوئی کوشش کی گئی ہے وہ علیٰحدہ رہنے والے طبقے کے لیے تباہی کا باعث ہوئی ہے۔''

ایک اور سلسلے میں انھوں نے کہا تھا، ''میں ایک سوشلسٹ اس لیے نہیں ہوں کہ میں سوشلزم کو کامل اور بہترین جانتا ہوں، مگر بالکل روٹی نہ ہونے سے بہتر ہے کہ ہمیں آدھی روٹی ہی میسر ہو۔ دوسرے نظام پرکھے جا چکے ہیں اور ان میں کم زوریاں تھیں۔ کیوں نہ ہم اس نظام کو پرکھیں، کچھ نہیں تو منھ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے ہی سہی۔''

اور آخر میں لندن کے ایک ڈاکٹر کی بیٹی اینی بسنٹ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ہندومت کی بازیافت کے سلسلے میں اسی زمانے میں ایک اہم شخصیت کے طور پر ابھری تھیں جب سوامی وویکانند یورپ اور امریکا میں ہندومت کی تبلیغ میں مشغول تھے۔ وہ ۱۸۹۸ء میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ترجمان بنی رہیں اور انھوں نے سینٹرل ہندو کالج کی بنیاد رکھی جو بعد میں بنارس ہندو یونی ورسٹی بنی۔ ہندوستان میں اپنے soujorn کی ابتدا ہی سے مسز بسنٹ ہندومت کی نشاۃِ ثانیہ سے منسلک ہوگئی تھیں۔ انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھا تھا:

''ہندوستان کے لیے سب سے پہلے ہمیں قدیم مذاہب کو تازہ کرنا، مضبوط کرنا اور ابھارنا ہوگا۔ یہ عمل ہمیں اپنی عزتِ نفس کو بحال کرنے، ماضی پر فخر اور مستقبل پر یقین کرنے میں مدد دے گا اور اس کے حتمی نتیجے میں ایک قسم کی وطنی زندگی کی ایک لہر وجود میں آئے گی اور ایک قوم کی دوبارہ تعمیر کی ابتدا ہوگی۔''

اس ہلچل کے برعکس جس نے تحریکِ آزادی کے بعد، جس کو انگریز ''غدر'' کہتے تھے، ہندو طبقوں کو فعال کیا تھا، مسلمان بالکل منجمد اور معطل ہوگئے تھے۔ مغل سلطنت کے فتح ہونے کے ساتھ ہی مسلمان طبقۂ امرا حکمرانی کے مرتبے سے معزول ہو گیا تھا۔ غدر کے بعد مسلمان طبقے پر مایوسی کے کالے بادل چھا گئے تھے اس لیے کہ ۱۸۵۷ء کی اتھل پتھل کا سارا الزام ان پر ڈال دیا گیا تھا۔ ایسے موقعے سے ہندوؤں نے وہ سارے تجارتی فوائد حاصل کیے جو ہندوستان میں تجارت کے فروغ کی وجہ سے سامنے آئے تھے جب کہ ان کے مسلمان بھائی معاشی طور پر پیچھے رہ گئے، اس لیے کہ انھوں نے کاروبار کے سلسلے میں کوئی خاص رغبت ظاہر نہیں کی تھی۔ اور جب نئے قائم ہونے والے اسکولوں میں مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں کے بچے بھرے جا رہے تھے، مسلمانوں نے خود کو اس سے بالکل الگ رکھا۔ نتیجے کے طور پر قانون، طب، تعلیم اور صحافت کے میدان مسلمانوں کے لیے بند ہوگئے اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں میں سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی۔ جب کہ بنگالی، ہندو، مدراسی اور مرہٹے یورپ کے فنون اور سائنس سے بہرہ مند ہو رہے تھے اور ان کی دانش اور اخلاقی نشاۃِ ثانیہ ہو رہی تھی، سارے ہندوستان کے مسلمان مادی مفلوک الحالی اور عقلی پس ماندگی سے دوچار تھے۔

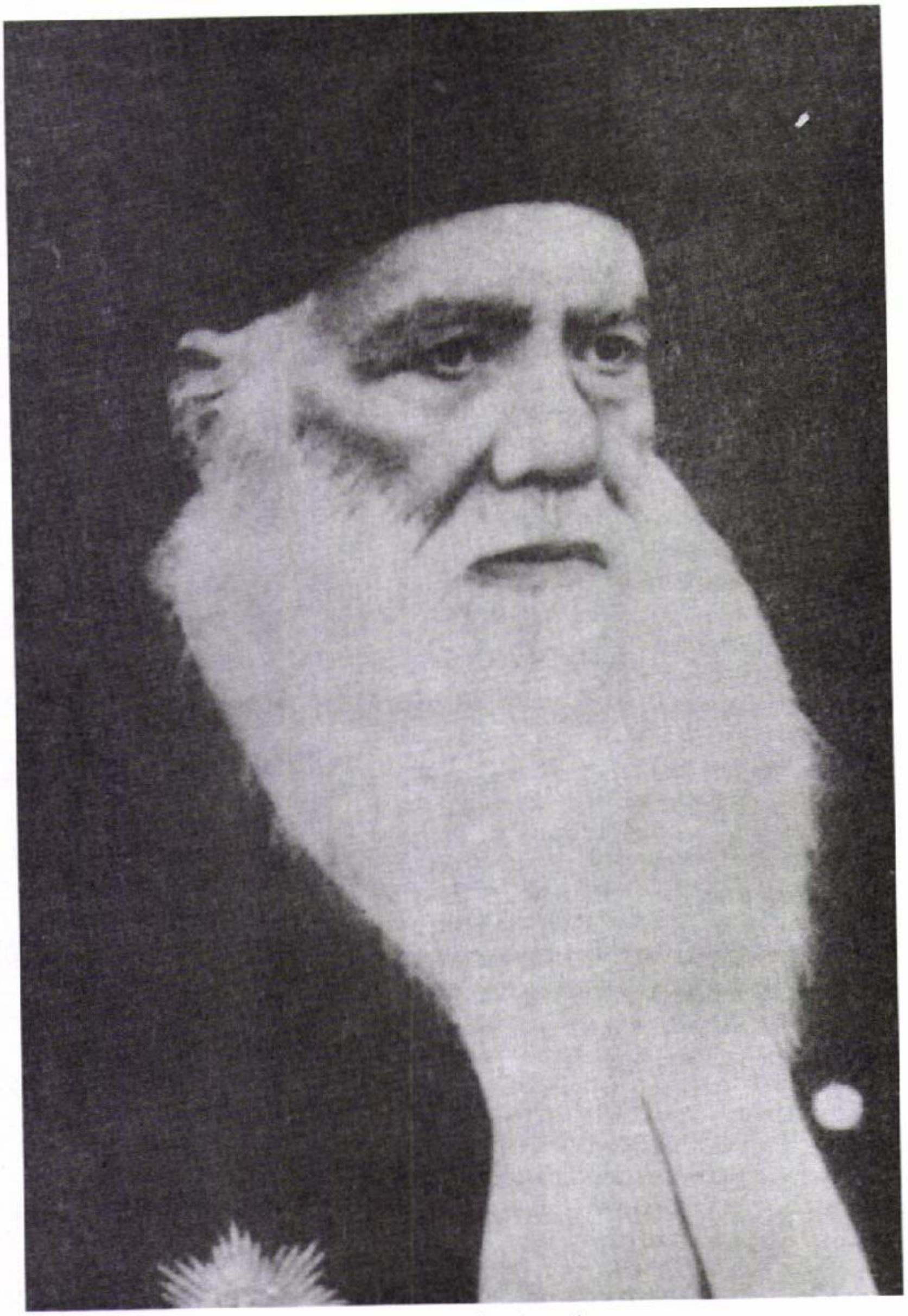

سرسیّد احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء)

سرسیّد کے رفقائے کار جنھوں نے ان کے مقصد کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دیں (کھڑے ہوئے دائیں سے) پروفیسر آرنلڈ، مولانا شبلی (بیٹھے ہوئے دائیں سے) مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، محسن الملک اور وقار الملک

# سر سیّد احمد خان

## عظیم مصلح، بابائے علی گڑھ

ایسے ناگفتہ بہ حالات تھے جن میں وہ عظیم انسان ابھرا، مسلمانوں کا نجات دہندہ، رہبر اور رہنما جس کو سر سیّد احمد خان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میرے نزدیک ہندوستان کی مٹی نے جتنے عظیم سپوت جنم دیے ہیں ان میں جناح، اقبال اور چند دوسرے لوگوں کے علاوہ، واقعتاً سر سیّد مسلمانوں کا نجات دہندہ نکلا جس کے بغیر بلا شبہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کسی اور راہ پر چلی گئی ہوتی۔

ہم نے دیکھا کہ غدر کے بعد، جس کو ہندوستانی جنگِ آزادی کہنا پسند کرتے ہیں، آنے والے برسوں میں مسلمانوں کی قسمت انتہائی تنزلی کے درجے پر تھی۔ چوں کہ وہ تحریکِ آزادی میں مرکزی کردار ادا کر رہے تھے اس لیے وہی انگریزوں کے ردِ عمل کا ہدف بنے۔ اس وقت دہلی نہ صرف آخری مغل بادشاہ کی قیام گاہ تھی، برصغیر کے مسلمانوں کے لیے یہی شہر معاشرتی، روحانی اور دانشوری کا مرکز تھا۔ اور یہی جگہ تھی جس کو سب سے زیادہ مصیبت جھیلنی پڑی تھی۔ برطانوی قبضے کے ساتھ ہی بلا کسی تمیز کے قتلِ عام، آتش زنی، اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ سرِ راہے چلتے ہوئے لوگوں کی بلا جواز گرفتاری، جائیداد کی ضبطی اور موت کی سزاؤں نے، جو روز کا معمول بن گئیں تھیں، مسلمانوں کی اشرافیہ کا تقریباً قلع قمع کر دیا تھا۔

اس قسم کے حالات کے لیے مسلمانوں کی قسمت کو قصور وار اس لیے نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ مسلمان خود اس کے ذمہ دار بن رہے تھے۔ مسلمانوں نے ہر اس شے کو جس کا انگریزوں سے دور کا بھی تعلق ہو، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری، ناپسند کرنا شروع کر دیا تھا جس میں انگریزوں کا دیا ہوا نظامِ تعلیم بھی شامل تھا۔ اس طرح مسلمان ایسے چکر میں پھنس گئے تھے جس نے ان کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر زبوں کر دیا تھا۔

سر سیّد احمد خان کی وہ ہستی تھی جس کی رہنمائی میں مسلمانوں کو اپنی خود ساختہ علیحدگی اور دانشورانہ تنزلی سے نکلنا تھا۔ اور اسی شخصیت نے ایسے مشکل حالات سے نکلنے میں مسلمانوں کی کامیابی سے مدد کی۔ سر سیّد ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک مذہبی گوشہ نشین انسان تھے، اس لیے سر سیّد کے بچپن کا بیشتر وقت اپنے نانا کے گھر گزرا جو مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے وزیر تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے باپ اور نانا سے مذہب سے لگاؤ اور سیاسی دور اندیشی ورثے میں پائی۔ بڑے ہونے کے بعد سر سیّد ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ انصاف میں ملازم ہو گئے اور اپنا فالتو وقت کتابیں لکھنے اور تدوین میں صرف کرنے لگے جن میں بیشتر مذہبی معاملات، اور بر صغیر کے مسلمانوں کے درخشندہ ماضی کے بارے میں ہوتیں۔ اپنی ملازمت کے نو برسوں میں سر سیّد نے ''سید الاخبار'' کے نام سے ایک اخبار نکالا، دینیات پر مختصر رسالے لکھے، اور اپنے عظیم کام ''آثار الصنادید'' پر کام کیا۔ انھوں نے ''آئینِ اکبری'' کے عنوان سے مغل شہنشاہ اکبر کے دور کی تاریخ بھی مرتب کی۔

۱۸۵۷ء کی ''بغاوت'' کے وقت تک نو سرسیّد کی دلچسپیاں تہذیبی مسائل تک محدود رہیں۔ ان کا مطالعہ ماضی کے بارے میں تھا اور ان کو مستقبل کے بارے میں کوئی تشویش نہ تھی۔ مگر ''بغاوت'' کے شروع ہوتے ہی یہ سب اچانک تبدیل ہوگیا۔ انھوں نے اس تحریک کے دوران ہونے والے واقعات اور حالات کا روز نامچہ تیار کرنا شروع کردیا اور یہی مسئلہ ان کے ذہن پر مسلط ہوگیا۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ اس تحریک کے نتیجے میں ملک میں، اور بالخصوص مسلمانوں کے حالات میں ڈرامائی تبدیلیاں آئیں گی۔

جیسا کہ مہدی علی صدیقی نے ''ڈان'' اخبار کے شہ سرخی میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء ایک خونیں سال تھا۔'' اس برس نے صرف مغل سلطنت کا ہی نہیں مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی نظام کا بھی زوال دیکھا۔ نام نہاد بغاوت دراصل مرتی ہوئی معاشرت کی آخری جد و جہد تھی۔ اس کے بعد سے علم اور زیادہ علم ہی (مسلمانوں کی) زندگی کا رہنما اصول ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو بغاوت کے دوران ہونے والی جد و جہد کے پسِ پردہ ہونے کی پاداش میں بے رحمی سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس میں سپاہی، شاہی خاندان، اشرافیہ اور اوسط درجے کے لوگ شامل تھے۔''

صاف ظاہر ہے کہ ''غدر'' نے سرسیّد کے نظریات اور خیالات پر گہرا اثر ڈالا تھا جس کی وجہ سے ان کے تناظر میں وسعت پیدا ہوئی۔ ان کو محسوس ہوگیا کہ انگلستان کے عوام کی نظر میں ہندوستان کے بارے میں باتیں بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی ہوں گی۔ برطانوی ناول نگار ولیم تھیکرے کا، جو ۱۸۱۱ء میں ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا اور برصغیر سے جس کے مضبوط خاندانی رشتے تھے، بھی کچھ یہی خیال تھا۔ برطانیہ کے عوام الناس کے ہندوستان کے بارے میں جو تین تصورات عام تھے ان کے حوالے سے تھیکرے نے ۱۸۴۱ء میں لکھا تھا۔ وہ لوگ جو رومانی مزاج رکھتے تھے، ہندوستان کو کہانیوں اور حیرتوں کا دیس (Gorgeous East) سمجھتے تھے۔ ایک پریوں کی سرزمین جہاں کے سلاطین مور کے پروں سے بنے پنکھوں کے سائے میں، سنگِ مرمر اور قیمتی جڑاؤ پتھروں سے مزین ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ عمومی ذہنیت کے لوگ ہندوستان کو کم زور اور جنگ و جدل میں بزدل لوگوں سے پُر اور ملائیت کے پیروکار سمجھتے تھے۔ متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے نزدیک ہندوستان وہ سرزمین تھی جس میں چھوٹے بھائیوں کو قسمت آزمانے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔

سرسیّد نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مشکلات ہی مشکلات تھیں، اس لیے کہ، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، غدر کی ناکامی کے بعد ان ہی کو اس کا مجرم سمجھا جاتا تھا اور ان سے نہایت بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ چوں کہ برطانیہ کے عوام اصلیت سے نابلد تھے، جب ۲۷ر جون ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے شروع ہوانے والی ''بغاوت'' اور دہلی پر قبضے کی خبریں برطانیہ پہنچیں تو فضا افسردہ سی ہو گئی۔ اخبار Saturday Review نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ فسادات کے پیچھے گہری سازش کارفرما معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی کہ یورپی باشندوں کے قتل اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہندوستان اس قسم کی نسلی خانہ جنگی کے قریب ہے جیسی کہ ساٹھ برس قبل غلاموں اور ان کے آقاؤں کے درمیان ہیٹی میں ہوئی تھی۔

اور جیسا کہ اس قسم کے ابتر حالات میں ہوتا آیا ہے، برطانوی اس کو ''بغاوت'' کا نام دیتے تھے جب کہ ہندوستانی ''جنگِ آزادی'' کہتے تھے اور یہ دونوں مختلف اصطلاحیں طرفین کے نزدیک اپنے معانی میں وزن رکھتی تھیں۔ اس جد و جہد کے ختم ہونے سے پہلے ہی برطانوی اذہان اس کو خیر اور شر کے درمیان جنگ سمجھتے تھے، ایسی جنگ جس میں خیر اور عیسائی عقیدے کے داعی شر پسندوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہوں۔ اس نوع کے تصورات برطانوی ذہنوں کے لیے خطرناک ثابت ہوئے اور جن کی بنا پر صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ برطانوی راج کے دوسرے علاقوں میں بھی گہرے اثرات کا باعث ہوئے۔ 'بغاوت' سے ایک عشرہ قبل ہی ہندوستان میں نسلی سطح پر تکبر کے رویّے ابھرنے لگے تھے اور ہندوستانیوں کو نیگر یعنی کالا یا دیسی کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ برطانیہ کے عوام کو اخباروں میں شائع ہونے والی کہانیوں کے ذریعے یہ تاثر ملنے لگا کہ وہی لوگ (ہندوستانی) جو 'بغاوت' سے قبل ترقیاتی کاموں میں مدد ہو سکتے تھے، اب اپنی مددگار قوتوں (برطانوی

راج) کے خلاف صف آرا ہو گئے ہیں۔ یعنی یہ صرف برطانوی راج ہی پر حملے نہیں تھے بلکہ ان تمام قدروں پر حملے تھے وکٹوریائی عہد کو جن پر ناز تھا۔ ایک عام انگریز کے نزدیک یہ 'جنگ' کچھ سپاہیوں کی 'بغاوت' کے سوا کچھ نہ تھی۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی نظر میں ان واقعات کے تجزیے کچھ اور ہی منظر پیش کرتے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک اس بات کے محکم شواہد موجود تھے کہ یہ سپاہیوں کی ایک معمولی بغاوت نہیں بلکہ ایک باقاعدہ جنگِ آزادی تھی جس کے ذریعے غیر ملکیوں کو دیس سے نکالنے کے بعد برصغیر کے قانونی حاکموں کو بحال کرنا مقصود تھا۔ میرے خیال میں، مسلمان یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ جد و جہدِ آزادی کی ناکامی ہی ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کی بنیاد تھی۔ اس بات کے تاریخی ثبوت موجود ہیں کہ صرف شبہے کی بنا پر بھی بہت سے مسلمان سولی پر چڑھائے گئے اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اس نوع کی ظالمانہ سزاؤں سے بڑھ کر نقصان دہ تو یہ تھا کہ برطانوی راج کی حکومت نے تقریباً پچاس برس کے عرصے تک باقاعدہ زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کو نظر انداز کیا۔

اب سوال یہ تھا کہ ان لوگوں کا کیا کیا جائے؟ چوں کہ ہندوستانیوں کو 'مہذب' بنانے کے کام کو بہر حال آگے بڑھانا تھا اس لیے اس دور کے نظریہ سازوں کے نزدیک دو ہی طریقے تھے۔

پہلا طریقہ تو یہ تھا کہ اپنی ایشیائی رعایا پر اپنے مذہب کے خالص اصولوں، اپنی درشت قوتوں، اپنے لطیف علم، اپنی خلاقانہ صلاحیتوں، اپنی حاکمانہ اور ناقابلِ تسخیر قوتِ ارادی کے ساتھ سخت مگر منصفانہ، عقل مندی اور فیاضی کے ساتھ حکومت کی جائے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ہم کو اپنی رفعت کے تصور کو ترک کر دینا چاہیے اور ہندوستانیوں کو ملکہ معظمہ کی رعایا کا رُتبہ دے کے ان کو حکومت کرنے کے رموز سکھانے چاہییں تا کہ ان کو خود پر حکمرانی کے لیے تیار کیا جائے۔ یعنی ان کو برطانیہ کے عام لوگوں کی طرح آزاد بنایا جائے۔

رسالے ''نیشنل ریویو'' نے اپنے صفحات پر کچھ اس طرح کا خلاصہ پیش کیا تھا اور ظاہر ہے کہ سرسیّد احمد خاں، جو کہ اب اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ ان کے ملک کے لوگوں، بالخصوص مسلمانوں کو یورپی تہذیب کی اچھائیوں کو قبول کر لینا چاہیے، ان تمام باتوں سے خوب واقف رہے ہوں گے۔ اسی تناظر میں انھوں نے اردو زبان میں 'اسبابِ بغاوتِ ہند' کے نام سے ایک مجلّہ شائع کیا اور برطانیہ کی حکومت کو ارسال کیا۔ اپنے تجزیے کے مطابق 'بغاوت' کے اسباب کی بنیاد پر سرسیّد نے برطانیہ کی حکومت کو اپنی سفارشات پیش کی تھیں کہ مقامی آبادی کو سیاسی معاملات میں شامل کیا جانا چاہیے تا کہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ برطانیہ کی حکومت کے اربابِ اقتدار یقیناً قابلِ تعریف تھے کہ انھوں نے سرسیّد کی پیش کردہ تجاویز پر سنجیدگی سے غور کیا اور ۱۸۵۷ء کے بعد سے کی جانے والی تبدیلیوں میں سرسیّد کے خیالات کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

سرسیّد اب اپنے فاضل وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ مغربی تعلیم کے پرچار میں اور مرادآباد اور غازی پور میں اسکول قائم کرنے پر خرچ کر رہے تھے۔ انھوں نے سائنس، تواریخ اور ادب کی انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی غرض سے ایک ادارہ ''ٹرانسلیشن سوسائٹی'' قائم کیا جس کو بعد میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' سے پکارا جانے لگا۔

شروع ہی سے سرسیّد کی کوشش تھی کہ اپنے ملک کے تمام لوگوں کی ترقی کے لیے تعلیم کے میدان میں کام کیے جائیں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب یا طبقے سے ہو۔ مگر جب ۱۸۶۷ء میں بنارس سے، جہاں سرسیّد ملازمت پر مامور تھے، اردو مخالف تحریک کا آغاز ہوا تو حالات نے پلٹا کھایا اور سرسیّد نے اپنا طریقِ کار تبدیل کر دیا۔ اس صورتِ حال سے سرسیّد اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ اگر ہندو اور مسلمان صرف ایک قومی زبان پر متفق نہیں ہو سکتے تو برصغیر میں ایک قومیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقام سے انھوں نے خود کو مکمل طور پر مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا اور انگلستان سے واپسی کے بعد، جہاں وہ آکسفرڈ اور کیمبرج یونی ورسٹیوں کی کارکردگی کے مطالعے کے لیے گئے تھے، Society for Progress of Indian Muslims نامی ادارے کی بنیاد ڈالی جس نے علی گڑھ میں

Mohammaden Anglo-Oriental College قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

۱۸۵۷ء میں ابتدائی تیاریوں کے لیے اسکول قائم کیا اور جب ۱۸۷۶ء میں سرسیّد سرکاری ملازمت سے فارغ ہو گئے تو علی گڑھ سے تعلیمی اصلاح کی تحریک کا بیڑا اٹھایا۔ ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو Mohammaden Anglo-Oriental College کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، سرسیّد جس کو قائدین کی پودگاہ بنانا چاہتے تھے۔

کالج کے قیام کے بعد ۹۰ء میں سرسیّد نے Mohammaden Education Conference کی بنیاد ڈالی۔ جگہ جگہ اس کے جلسے منعقد ہوئے اور علی گڑھ کا پیغام برصغیر کے ہر حصے تک پہنچ گیا۔ یہ کوشش تھی مسلمانوں کو، جو ابھی تک پس ماندہ تھے جنھیں جدید دنیا کی تعلیمی، معاشی، سماجی اور ادبی منطقوں کی ضروریات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا۔

ملکہ برطانیہ سے سر کا خطاب پانے کے بعد سرسیّد کا مسلمانوں کے لیے یہ پیغام تھا کہ ان کو اپنے فرسودہ توہمات اور عصبیات کو دفن کر دینا چاہیے۔

ان کا استدلال یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندازِ زندگی کی تخلیقِ نو ہونی چاہیے اور یہ مغربی تعلیم کے حصول سے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ اور انھوں نے یہ بھی استدلال کیا کہ یہ طریقہ، کار اسلام کی تعلیمات کے منافی ہرگز نہیں ہے اور اس ضمن میں انھوں نے پیغمبرِ اسلام کی وہ حدیث دلائی جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ اگر علم حاصل کرنے کے لیے چین بھی جانا پڑے تو جانا چاہیے۔ علی گڑھ کالج کے کوائف نامے میں، جو بعد میں یونی ورسٹی بن گیا تھا، اس کا اوّلین مقصد جو لکھا گیا تھا اس کا نچوڑ یہی تھا کہ ایسا کالج قائم کیا جانا چاہیے جہاں بغیر کسی روک ٹوک اور مذہبی تنگ نظری کے مسلمان مغربی تعلیم حاصل کر سکیں۔

ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے، ''میں ان چیزوں کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں جن میں، ہمارے ملک کے خصوصی حالات کی وجہ سے، ہم اور انگریز مختلف ہیں۔ میں صرف شائستگی، علم، صفائی، اعتبار، ہنرمند کارکردگی، کامیابیوں وغیرہ پر زور دینا چاہوں گا جو ان کی تعلیم اور تہذیب کا نتیجہ ہیں۔ مہربان قدرت نے ساری اچھائیاں، دنیاوی ہوں یا روحانی، جو انسان میں ہو سکتی ہیں، یورپ، اور بالخصوص انگلستان کو عطا کی ہیں۔''

میں نے بہت سمجھ بوجھ کر یہ اقتباس چنا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ان تعریفی الفاظ سے جو سرسیّد نے استعمال کیے ہیں، پوری طرح اتفاق نہیں کریں گے۔ پھر بھی ہمیں سرسیّد کی ضرورت سے زیادہ پُر جوش بات سے اتفاق کرنا ہوگا جو انھوں نے مغرب اور بالخصوص برطانیہ کے حوالے سے، موجود حالات کے تناظر میں کہی ہے۔ انگلستان میں اپنے قیام کے دوران سرسیّد نے جو کچھ دیکھا وہ اتنا زیادہ مختلف نہیں تھا مگر ابتدائی جائزے کے دوران بہ ظاہر ہندوستان کے مقابلے میں ترقی یافتہ اور بہتر لگا ہوگا۔ تو کیا ان کا ضرورت سے زیادہ ردِعمل سمجھ میں آنے والا نہیں؟

کیا برطانیہ میں مقیم برصغیر کی تاریخ کے طالب علموں کے ساتھ یہی کچھ نہیں ہوا ہوگا جن کے اذہان کو ایک سو پچاس برس یا اس کے لگ بھگ عرصے اس قسم کی دانشورانہ، سیاسی اور سماجی ارتقا کی غذائیں ملتی رہی ہیں، اور انھوں نے وطن واپسی پر ان کو استعمال کرنے کی کوشش کی ہوگی؟ اس مرحلے پر ہمیں صرف گاندھی، نہرو اور جناح جیسی شخصیات ہی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

یہ یقیناً بالکل صحیح اور مناسب ہے کہ ان عظیم شخصیات کی قومی ہیرو کی طرح توقیر کی جانی چاہیے مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک اُن سیاسی اور دانشورانہ روایات کی پیداوار تھا جو برطانوی حکمرانوں نے اپنے ملک کو دی تھیں۔ یہ سب اور ان کے علاوہ بہتیرے اور بھی ان میں شامل ہوں گے جو، فرائض کی بجا آوری کے لیے اپنی مناسبت، حد سے زیادہ تعریف، مسئلہ پیدا کرنے والے اور انکسار وغیرہ کی بنا پر، جن سے سرسیّد بھی گزرے ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ سرسیّد جیسی ذہنی استعداد کی شخصیت پورے یورپ

میں اسی قسم کی عزت اور احترام کی حق دار ہوگی اس لیے کہ اس قسم کی شخصیت لندن، آکسفرڈ اور کیمبرج جیسے علمی مراکز میں بھی آسانی سے نہیں ملے گی۔ تو پھر ہمیں اس بات پر خوشی کیوں نہ ہو اگر سرسیّد کو ایسی توجہ ملی تھی۔ اس لیے ہم ان کو ان کی سادہ لوح رومانویت کے سلسلے میں معاف بھی کر سکتے ہیں اس لیے کہ ایسے 'گناہ' تو ان کے بہت سے ہم عصروں نے کیے ہوں گے۔ لہٰذا میں سرسیّد کے اخذ کردہ ان نتائج سے اتفاق کروں گا کہ جو انھوں نے مسلمانوں کے فائدے کے سلسلے میں کیے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے تو ان کی مندرجہ ذیل رائے بھی خاصی حد تک قابلِ قبول لگتی ہے۔

''سماجی اور سیاسی لحاظ سے پورے انگلستان کی آبادی ایک کمیونٹی کی مثال ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے بارے میں ایسا مفروضہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ان ممالک میں جہاں کی آبادی نسل اور عقیدے کے اعتبار سے ایک ہو، وہاں ہونے والے انتخابات بلاشبہ اکثریت کے مفادات اور نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مگر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اب بھی ذات پات کے مسائل موجود ہیں، جہاں بسنے والی مختلف النوع نسلوں میں آپس میں ملاپ نہیں ہوا ہے، جہاں جدید معیار کے مطابق تعلیم کے فوائد تمام طبقات تک نہیں پہنچ سکے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ وہاں کے انتخابات کے نتائج پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں اکثریت کلی طور پر اقلیت کے مفادات پر اثر انداز ہوگی۔

اب فرض کر لیا جائے کی انگریز برادری اور اس کی فوج، اپنی تمام توپوں اور ہتھیاروں کے ساتھ ہندوستان چھوڑ دیتی ہے تو پھر ہندوستان پر کس کا حکم چلے گا۔ ایسی صورت میں کیا اس بات کا امکان ہوگا کہ مسلمان اور ہندو، دونوں قومیں ایک ہی تخت پر بیٹھ کر اقتدار میں شریک ہو سکیں؟ قطعی ناممکن! دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کو فتح کرنا ہوگا۔ یا اس بات کی امید رکھنا کہ دونوں قومیں برابری کے حقوق کی حامل ہوں گی، قرین قیاس نہیں ہوگا ..... ساتھ ہی ساتھ آپ کو یہ بھی یاد رہے کہ اگر چہ تعداد کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کم ہیں، ان کے بہت کم لوگ انگریزی تعلیم حاصل کر سکے ہیں پھر بھی ان کو کم زور نہیں سمجھا جا سکتا..... یہ بات کہ ..... انگریزوں کے جانے کے بعد فاتح کون ہوگا ۔۔۔ خدا کی مرضی پر منحصر ہوگی۔ لیکن جب تک ایک قوم دوسری قوم کو فتح نہیں کر لے گی، اس سرزمین پر امن کی حکومت نہیں ہو سکے گی۔''

مندرجہ بالا اقتباس میں جس خوف کا اظہار کیا گیا ہے اس کو اکثر پہلا اشارہ یا ایک پیغام کے لمحۂ القا کے طور پر دیکھا گیا اور چند برسوں بعد اسی کو مختلف صورتوں میں برصغیر ہی کے ایک اور عظیم مسلمان دانشور محمد اقبال نے پیش کیا۔ ایک پیغام جس کو مسلم لیگ نے با قاعدہ اپنا زادِ راہ سمجھا اور بعد میں اسی کو ''دو قومی نظریہ'' کا بہتر نام ملا اور یہی مسلم لیگ کا نعرہ بنا جس نے آخرِ کار برصغیر کی تقسیم کی۔

بہت سے تاریخ نگاروں کا یہی خیال تھا مگر شاید خود قائدِ اعظم کا، کافی عرصے تک، کوئی اور نقطۂ نظر تھا جس پر میں آگے چل کر اظہارِ خیال کروں گا۔ اور شاید بعینہ کچھ یہی الفاظ نہیں تھے، جو میں نے نقل کیے ہیں، جن سے اس مسئلے کی ابتدا ہوئی تھی۔ میرے نزدیک یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ سرسیّد نے مختلف موقعوں پر اسی نوع کے بیانات دیے تھے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی پریشانی کا سبب یہی تھا کہ نہ صرف ہمیشہ ہندو اکثریت ہی اس ملک پر چھائی رہے گی بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے مسلم اقلیت کو مغلوب رکھے گی۔

اس اقتباس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ عمومی تصور کہ اقبال برصغیر کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے ''دو قومی نظریہ'' کا ذکر مسلم لیگ کے ۱۹۳۰ء کے الہ آباد کے جلسے میں اپنے صدارتی خطبے میں کیا تھا، صحیح نہیں۔ سرسیّد کی بہت سی اہم تقریروں میں سے ایک تھی جو انھوں نے میرٹھ میں مارچ ۱۸۸۸ء میں کی تھی جس میں انھوں نے ''ہماری مسلمان قوم'' کا ذکر کیا تھا جس کی بنا پر ملک ''مسلمان قوم'' اور ''ہندو قوم'' میں تقسیم ہو گیا تھا۔

اگر چہ بہت سے لکھنے والوں اور تاریخ نگاروں کا خیال تھا کہ سرسیّد کی تقریروں اور تحریروں میں ''دو قومی نظریہ'' کی پرچھائیاں نظر

آتی ہیں، کچھ یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر ان کے نزدیک لفظ ''قوم'' سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ ایک انگریز تاریخ نگار نے لکھا ہے، ''وہاں دو قومیتیں نہیں تھیں، وہاں ایک قوم نہیں تھی، بلکہ وہاں تو کوئی قوم ہی نہیں تھی۔'' صحیح معنوں میں یہ بالکل صحیح ہے۔ اس کے باوجود میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کی سرسیّد نے اس طرح نہیں سوچا ہوگا جیسا کی ان کے ہم عصر یورپ کے تاریخ دانوں نے ''قومی ریاست'' اور ''قومیت'' کی تعریف کی ہے۔

لہٰذا ہمیں پاکستان کے موجودہ سربرآوردہ تاریخ کے ماہروں سے اتفاق کرنا ہوگا جن کے نزدیک ''سرسیّد ایک علیٰحدگی پسند مسلمان تھے جو ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو ایک علیٰحدہ سیاسی دھڑے کے طور پر پیش کرنے کے پس منظر میں ہندوستان میں علیٰحدگی پسند مسلمان تحریک کی داغ بیل ڈال رہے تھے، ایک بنیاد جس پر آگے چل کر علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم قومیت کی عمارت کھڑی کی اور پاکستان نام کی خودمختار ریاست کا مطالبہ کیا۔'' اور، میرے خیال میں، اس کے سنگِ بنیاد رکھنے کے بعد کے معاملات ہی اصل مسائل ہیں۔ یہی مرکزی اور فیصلہ کن مرحلہ تھا جس کے لیے تاریخ نگار سرسیّد کو مسلمانوں کے مفاد میں اہم ترین شخصیت گردانتے ہیں، جس کے بغیر شاید تاریخ نے کچھ اور ہی موڑ لیا ہوتا، جس کے بغیر شاید پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔

سرسیّد کی تعلیمات کو غائر نظر سے دیکھنے والے کو اس بات پر یقیناً کوئی حیرت نہیں ہوتی کہ انڈین نیشنل کانگریس کے ۱۸۸۵ء کے بمبئی میں منعقدہ اجلاس کے بارے میں ان کے اپنے کچھ نظریات تھے۔ سرسیّد کانگریس کی ابتدا ہی سے اس کو مسلمانوں کے مفادات کے لیے ممکنہ خطرہ محسوس کرتے تھے۔ وہ آبادی کی بنیاد پر کیے جانے والے فیصلوں کے سخت مخالف تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک اس طرح مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اقلیت گردانا جانے لگتا۔ اسی بنا پر یہ تعجب خیز نہیں لگتا کہ وہ مسلمان بھائیوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے منع کرتے تھے۔

اپنی تقریروں میں سے ایک میں انھوں نے کہا تھا:

''میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ میں سب سے پہلے آپ کو وجہ بتا دوں کہ آج کی شام کے موضوع پر میں کیوں بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، ایک عرصے سے ہمارے بنگالی دوست سیاسی معاملات پر جنگی نوعیت کے احساسات رکھتے ہیں۔ تین برس قبل انھوں نے ایک بڑی اسمبلی بنائی، مختلف مقامات پر اس کے اجلاس منعقد ہوئے ہیں اور انھوں اس ادارے کو نیشنل کانگریس کا نام دیا ہے۔ ہم نے اور ہماری قوم نے اس مسئلے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس طرح ہمارے بنگالی دوستوں نے ہمارے قومی معاملات میں ایک نہایت غیر منصفانہ اور ناقابلِ قبول دخل اندازی کی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم ان پر اچھی طرح واضح کر دیں کہ انھوں نے کیا غیر ضروری مداخلت کی ہے اور یہ بھی کہ ان کی اس طرح کی حرکتوں سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں جن سے ہم کو اپنی قوم کو بچانا ہوگا۔''

سرسیّد نے ہندوستان میں ہندو قوم کی موجودگی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، نہ ہی کبھی انھوں طبقاتی اثرات کے معاملے میں ان کو اوّلیت دینے انکار کیا۔ ان کو اس بات کا اعتراف تھا کہ ہندو اس ملک کی اکثریت ہیں اس لیے نہ صرف ان سے دوستی کی بلکہ ان سے اچھے تعلقات کی سرسیّد نے ہمیشہ وکالت کی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کو دلہن کی مثال قرار دیا ہندو اور مسلمان جس کی دو آنکھیں ہیں۔ مگر اکثر لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسی خوب صورت مثال سے انھوں نے یہ پیغام دیا تھا کہ ہندوستان کا حسن اس بات پر منحصر ہوگا کہ اس کی دونوں آنکھوں میں ایک جیسی چمک ہو۔

مگر دونوں طبقوں کے درمیان افہام تفہیم پر انھیں کبھی اعتبار نہیں رہا۔ ایک بار انھوں نے ہندوؤں کو تنبیہ کی تھی کہ اگر انھوں نے کبھی وہ راستہ اختیار کیا جو ہم کو نقصان پہنچائے گا یا ہماری قوم کو داغِ بدنامی دے گا تو پھر واقعتاً ہم کبھی دوست نہیں رہ سکیں گے، ہم اپنی تمام تر قوت سے اپنے لوگوں پر حملوں کا دفاع کریں گے۔ اور بدقسمتی سے ۱۸۶۷ء میں اس نوعیت کے واقعات ہو چکے تھے جب یوپی میں ہندوؤں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ صوبے کی سرکاری زبان کا رسم الخط فارسی سے ہندی میں بدل دیا جائے۔

یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا حل شیشے کے محلوں میں رہنے والے دانشوروں کے بس سے باہر تھا، اس لیے کہ پورے صوبے میں بسنے والے مسلمان اور ہندو دونوں کے درمیان بے اعتباری کی خلیج پیدا ہورہی تھی۔ ہندو مسلم کے درمیان بھائی چارہ اور افہام وتفہیم کے سلسلے میں سرسیّد کی ناامیدی اور بے اعتباری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس تنازعے سے سرسیّد اس بات کے قائل ہوتے جارہے تھے کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کی بابت ہندو اور مسلمانوں کے نظریات مختلف ہوں گے۔

۱۸۵۰ء کے عشرے تک ہندو مسلمانوں کے تہذیبی ورثے کے شراکت دار تھے جو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں تشکیل پایا تھا۔ اردو صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستان کے دونوں طبقوں کی مشترکہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر نے ایک بار کہا تھا کہ ہندوستان کی زبان کی حیثیت سے فارسی کے بجائے اردو کو قبول کرلینا ہی ہندوستانی قومیت کے لیے ایک رعایت تھی۔

تنازعے کی اس وجہ کے علاوہ ۱۸۵۰ء کے بعد سے دھیرے دھیرے ایک اور مسئلہ سر اُٹھا رہا تھا جو دونوں طبقوں کے درمیان گرما گرم بحث کی بنیاد بن رہا تھا: یعنی ذبیحہ گاؤ۔ اس سے قبل مسلمانوں کے اس 'حق' پر کوئی تنازعہ نہیں اُٹھا تھا۔

قائداعظم اکادمی کے مؤسس ڈائریکٹر پروفیسر شریف المجاہد نے ان دونوں تنازعات کے علاوہ تیسرے کا مندرجہ ذیل خلاصہ پیش کیا ہے:

''تجدیدیت اور گروہ بندی کے زیرِ اثر، وہ ہندو ہی تھے جنھوں نے ہندوستان کے (۱) تہذیبی ورثے سے اشتراک، (۲) ذبیحہ گاؤ پر ایک طرح کے غیر رسمی سمجھوتے اور (۳) ایک مدت سے مسلمانوں کے تہواروں میں شرکت سے منھ موڑ لیا اور ہندوؤں کے اپنے تہواروں کو رواج دینا شروع کردیا۔ ہندوؤں کے یہ تینوں اقدامات تفرقہ انگیز تھے۔ لہٰذا وہ ہندو ہی تھے جنھوں نے انیسویں صدی کی ہندوستانی کائنات کو درہم برہم کیا۔ اس اتھل پتھل کا سب سے دوررس نتیجہ یہ نکلا کہ مشترک تہذیبی ورثے کی بنا پر بجائے ایک قومیت کی تشکیل کے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ راستوں پر چل پڑے اور بالآخر مسلمانوں نے ۱۹۴۰ء کے ہزاروں پلیٹ فارموں سے اپنی الگ قومیت کا اعلان شروع کردیا۔''

سرسیّد احمد خان کو اس بات کا احساس تھا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان عددی اقلیت تھے، تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ اور معاشی طور پر کم زور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ برطانوی اذہان میں ۱۸۵۷ء کی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ انھیں اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ کانگریس کی سیاسی سرگرمیاں یقیناً حکومت سے محاذ آرائی پر منتج ہوں گی۔ انھیں یاد تھا کہ مسلمان اور ان کی اشرافیہ کس طرح برباد ہوئی تھا اور یہی کچھ پھر ہوگا اگر مسلمانوں نے سیاسی مظاہروں میں حصہ لیا۔

سرسیّد نے بہت جلد اندازہ لگالیا تھا کہ انیسویں صدی میں اُٹھنے والی ہندو مذہبیت کے احیا کی تحریک اپنے اصل کردار میں برطانیہ مخالف کم اور مسلمان مخالف زیادہ تھی۔ اس کی سب سے واضح مثال بنگالی زبان کے سب سے اہم اور مشہور ناول نگار بنکم چندر چٹرجی کے ناول Anandamath کی ۱۸۸۲ء میں اشاعت تھی۔ ''اس ناول میں صریحاً مسلمان مخالف راگ الاپا گیا تھا۔'' خالد بن سعید کے مطابق'' اس ناول کا قاری بچوں (کالی مائی کی اولاد) کے ایک ایسے طبقے سے دوچار ہوتا ہے جو کسی ذات پات پر یقین نہیں رکھتے اور جن کا اصل مقصد ہندوستان سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانا تھا۔۔۔ ناول کے بچوں کا یہ گروہ مسلمانوں کی آبادیوں کو جلاتا، لوٹ مار کرتا اور بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا خون بہاتا تھا۔ اور غور کرنے کے لائق دل چسپ بات یہ تھی کہ اس ناول کے ہندو لیڈر صاف صاف یہ کہتے ہیں کی برطانیہ ہندوستان کو غلام بنانے نہیں بلکہ اس کو مسلمانوں کے چنگل سے نجات دلانے کی غرض سے آیا ہے۔ ناول کے آخر میں، جب بچوں نے مسلمانوں پر فتح حاصل کرلی تو ناول کے روحانی پیشوا نے، جو تحریک کی رہنمائی کررہا تھا، بچوں کے سردار کو حکم دیا کہ لڑائی روک دیں اور برطانوی اہل کاروں کا ہاتھ بٹائیں تاکہ خدا کی مدد سے برطانوی ملک کو نجاست سے پاک کرسکیں اور اس کی حکومت کو ہندوؤں کے حوالے کرسکیں۔ یہی ناول ہے جس میں پہلی بار بندے ماترم (ماں تجھے سلام) گانا پیش کیا گیا تھا۔ اس طرح اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

مسلمانوں نے بعد میں (۳۹۔۱۹۳۷ء) کیوں کانگریس حکومت کے اس گیت کو قومی نغمہ بنانے پر شدید احتجاج کیا تھا۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، کانگریس کی تحریک کا پہلا سرکاری اجلاس ۱۸۸۵ء میں پونے میں ہوا تھا۔قومی جذبات کے احساس کی بڑھتی ہوئی لہروں اور انیسویں صدی کے اواخر میں ہندومت کے احیا کے پیشِ نظر قومی دھارے کے کچھ اہم لیڈر ایک مشترکہ پلیٹ فارم کا مطالبہ کر رہے تھے اور ۱۸۸۳ء میں کلکتے میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے تمام علاقوں سے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کے اگلے برس جب مدراس میں تھیوسافیکل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام جلسہ منعقد ہوا تو اس میں بھی قومی جذبات کی ترجمانی ہوئی تھی۔

اس دوران ایلن آکٹاوین ہیوم (Allan Octavian Hume) نامی ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر نے، ظاہر ہے کہ اس کو لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) وائسرائے کی حمایت حاصل رہی ہوگی، اسی قسم کی مصروفیات کا آغاز کر دیا۔تیس برس تک ہندوستان کی افسر شاہی کا حصہ ہونے کے بعد اس نے یہاں کے مسائل میں دل چسپی لینی شروع کر دی۔ اس کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ برطانوی راج نے اس ملک کو سیاسی استحکام بخشا ہے مگر اس کے باوجود عام لوگوں کے معیارِ زندگی کو اونچا کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ برطانوی افسر شاہی لوگوں کے حالات سے باخبر ہے اور یہ بے انتہا ضروری تھا کی واضح طور پر ایسے آئینی راستے اختیار کیے جائیں جس کی مدد سے مغربی خیالات اور تعلیم کی آمیزش سے پیدا ہونے والے ابال کو خارج کیا جا سکے۔

اپنے یقین پر عمل کرتے ہوئے ۱۸۸۳ء میں ہیوم نے کلکتہ یونی ورسٹی کے گریجویٹ لوگوں کو ایک خط ارسال کیا جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کی ذہنی، اخلاقی اور سیاسی باز آفرینی کی غرض سے ایک انجمن تشکیل دیں۔ کلکتے اور مدراس میں ان اجتماعات کے بعد دسمبر ۱۸۸۵ء میں پونے میں اجلاس منعقد ہوا جس کو آل انڈیا کانگریس کا پہلا اجلاس کہا گیا تھا۔ اس جلسے میں ۷۰/ افراد شریک ہوئے جن میں بیشتر ہندو وکلا، ماہرینِ تعلیم اور صحافی تھے۔ اس کے بعد سے ہر سال دسمبر کے مہینے میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں کانگریس کے اجلاس منعقد ہونے لگے۔ ۱۸۹۴ء میں ہندوستان کے شہر مدراس میں ہونے والے اجلاس میں نمائندوں کی تعداد بڑھ کر پندرہ سو ہوگئی جب کہ اس میں تین ہزار مہمان بھی شریک ہوئے تھے۔ کانگریس کے اوّلین لیڈروں میں جی کے گوکھلے، سریندر ناتھ بنرجی، فیروز شاہ مہتا اور دادا بھائی نوروجی جیسے لوگوں نے مغرب کی اور آزاد خیالی کی وکالت کی۔ ان لوگوں نے برطانیہ عظمیٰ کو سراہا اور اس کے اشتراک کے حواری بنے۔

کانگریس کے ایک اور رہنما رمیش چندر دت تھے۔ انھوں نے کانگریس کے بارے میں ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا، ''انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی ملک کے دماغ اور ضمیر کی نمائندگی کرتے ہیں، اور یہی پڑھے لکھے عوام کے اصل ترجمان، ان کے مفادات کے نگہبان ہیں۔ اس لیے جو سوچ سکتے ہیں انھی لوگوں کو حکومت کرنی چاہیے۔''

لارنس جیمس (Lawrence James) نے لکھا، ''اندر سے کانگریس بنیادی طور پر وفادار ہے۔ اس کے سالانہ اجتماعات میں ملکہ عظمیٰ وکٹوریہ کو ''مادر'' کے نام سے پکارا جاتا تھا اور اس کا نام آتے ہی تحسین کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ یہ پر خلوص مظاہرے دراصل ادارے کے بانی بزرگوں کی انگریز دوستی کی علامت تھے۔ اچھوت ستارن ساتھے (Achhut Sitaran Sathe) نے ۱۹۰۰ء کے اجلاس میں بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا، ''پڑھا لکھا ہندوستانی جبلت میں وفادار اور مفاد کے معاملے میں قناعت پسند ہے۔ انگریزی پرچم اس کی جسمانی پناہ گاہ ہے اور انگریزی فلسفی اس کے لیے روحانی تسکین۔ انگریزی نشاۃ الثانیہ ہندوستانی تعلیم یافتہ شخص میں اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ اس کو اپنے حاکم کی وفاداری کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ یہ نئی تہذیب کا وہ ہراول دستہ ہے جس کا جھنڈا ہے محبت، احسان اور برابری۔''

تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ روایت اور ترقی کے مابین اس قسم کا رومانی ہنی مون' دیر پا نہیں ہوتا۔ سماجی اور سیاسی نو ترتیبی کے تقاضے جلد یا بدیر شروع ہو جاتے ہیں اور اس نوع کے 'متاثر کن مظاہر' رفتہ رفتہ قومی دھنوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ اور بہت جلد ہی ہندو

نشاۃ الثانیہ کے بیان کیے ہوئے اثرات نے کانگریس تحریک کو جالیا اور وہی مغربی تہذیب کو بے جان اور مادّی کہنے لگے۔ سب سے بڑھ کر ہندو نشاۃ الثانیہ جو قومیت کا ایک نیا روپ بن رہی تھی، مذہبیت میں مدغم ہونے لگی اور بہت سے ہم عصروں کے نزدیک کانگریس ہندوازم کا پلیٹ فارم بن گئی۔

کوئی تعجب نہیں کہ کانگریس کے قیام کے بعد ہندوستان کے دو بڑے گروہوں کے بارے میں سرسید کا اندازِ نظر بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ کانگریس کے رہبر مطالبہ کر رہے تھے کہ حکومتی عہدوں پر تعیناتی کے امتحانات ہندوستان ہی میں ہونے چاہییں۔ سرسیّد کو خوف تھا کہ مسابقتی امتحانات ایک گروہ یعنی بنگالی ہندوؤں کی حکمرانی پر منتج ہوں گے۔ سرسیّد نے ان کے اس مطالبے پر اعتراض کیا کہ ہندوستان کے نمائندہ اداروں کی ملک کی انتظامیہ میں زیادہ شمولیت ہونی چاہیے۔ اور بے شک، سرسیّد نے بڑے شدّ و مد سے ان کے اس دعوے کی تردید کی کہ ان کو ہی 'ہندوستانی قوم' کی طرف سے بولنے کا حق ہے۔

سرسیّد کو یہ سب ہرگز قبول نہیں تھا۔ انھوں نے لکھا تھا، ''انڈین نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد تاریخ اور موجودہ دور کے حقائق سے ناواقفیت کی بنیاد پر رکھے گئے ہیں، وہ اس بات کا لحاظ نہیں کرتے کہ ہندوستان میں مختلف قومیت کے لوگ رہتے ہیں۔۔۔۔''

سرسیّد کے رسوخ کے نتیجے میں، جیسا کہ میں نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے، مسلمان نیشنل کانگریس سے متاثر نہیں ہوئے۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے پہلے اجلاس میں دو مسلمان مندوب شریک ہوئے تھے، اس کے بعد ۴۴۰ میں سے صرف ۳۳ مسلمان تھے، ۱۸۹۰ء میں ۷۰۲ مندوبین میں ۱۵۶ مسلمان تھے اور اس کے بعد اس میں تیزی سے کمی ہونی شروع ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں ہونے والے اجلاس کے ۷۵۶ مندوبین میں صرف ۱۷ مسلمان تھے۔ میرے خیال میں ان اعداد و شمار کے بعد مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگرچہ سرسیّد ان آزاد خیال لوگوں کے پروگرام کے بارے میں تشویش میں تھے جنھوں نے کانگریس تحریک کا ڈول ڈالا تھا تو وہ اور ان کے ساتھی ہندوستان کی نئی قومیت میں ہندوؤں کی اکثریت کے حوالے سے جو ملک پر چھاتی جا رہی تھی، جس میں بی جی تلک جیسے قوم پرست جنگجو شامل ہو رہے تھے، چوکنے تھے۔ وہ مسلمانوں کو غیر ملکی سمجھتے تھے اور مشہور ہندو قوم پرست شیواجی کی تقدیس کرتے تھے، جس نے سترہویں صدی عیسوی میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

ڈاکٹر سکندر حیات لکھتے ہیں کہ ''الغرض، سرسیّد نے مسلمانوں کو اس مشکل صورت حال سے نکالنے کے لیے، جس میں وہ ۱۸۵۷ء کے خروج کی بنا پر تھے، اپنے سیاسی مشغلے کا آغاز کر دیا۔ ان کو بالخصوص اس بات پر رنج تھا کہ انگریزوں کے مقابلے میں مسلمان نہ صرف سیاسی قوت کھو چکے ہیں بلکہ ان کو ہندوستان کے موجودہ حالات کا پورا ادراک بھی نہیں تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ مسلمان انگریز راج سے معاملت کر لیں۔ ان کو ہندوؤں سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔ وہ ہندوازم کے تیزی سے ابھرتے ہوئے مذہبی، سیاسی تجربات اور ملک کے متنوع اور مختلف حقیقتوں پر برطانوی طرز کی نمائندہ حکومت کا زبردستی نفاذ تھا جس کی بنا پر سرسیّد نے آگے بڑھ کر کانگریس کی نام نہاد 'قومیت' کے اعتقادات کو چیلنج کیا۔''

اور ''دوقومی نظریے'' سے کانگریس کا کھلا انکار ہندوستان میں مسلمان علیٰحدگی پسند قوتوں کی تحریک کی ترتیب کا باعث ہوا۔ سرسیّد نے مسلمانوں کو یہ شعور دیا کہ ان کے سیاسی مفادات ویسے ہی نہیں جیسے کی ہندوؤں کے ہیں اور یہ کہ مسلمان اور ہندو دو مختلف سیاسی گروہ ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو غفلت کے خواب سے جگانے اور برصغیر میں ان کو ایک سیاسی طاقت کے طور دوبارہ زندہ کرنے میں سرسیّد کا اتنا بڑا کردار ہے کہ اتنے مختصر سے خاکے میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کی کامیابیوں سے پورا انصاف ممکن نہیں۔ میں نے سرسیّد کے صرف ایک ہی پہلو، یعنی ایک عظیم ماہرِ تعلیم اور علی گڑھ تحریک کے مؤسس پر ارتکاز کیا ہے جو بالآخر مسلم لیگ کی بنیاد بنا اور جس کے اثرات پاکستان کی تخلیق پر منتج ہوئے۔ مگر ان تمام کاوشوں کے علاوہ مذہب کے میدان میں بھی ان کی کارکردگی اتنی ہی دم بخود کر دینے

والی تھی۔ اگر چہ قرآن کریم کی تفسیر مکمل نہ ہوسکی پھر بھی انھوں نے سات جلدیں مکمل کر لی تھیں۔ انھوں نے مذہب پر اور بہت سی کتابیں، مختصر رسائل اور مضامین تصنیف کیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کی تعلیمات ہر حال میں جدید سائنسی نظریات سے ہم آہنگ رہی ہیں۔ شاید یہ کچھ تعجب کی بات نہ ہوگی کہ بہت سے مذہبی مسائل پر ان کے خیالات کو قدامت پسند لوگوں نے قبول نہیں کیا مگر ان کی سیاسی تحریریں اور سماجی نو تشکیل کے ضمن میں ان کی وکالت مسلمانوں کی نئی نسل کے شعور کی بلوغت پر بہت اثر انداز ہوئیں۔ اگر ہم ماضی میں جھانک کر دیکھیں کہ سرسیّد نے کیا کیا تو ہم حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک مختصر عرصۂ حیات میں ایک انسان کیا کیا کر سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ صرف ان کی عظمت کی وجہ ہی سے نہیں ہوا بلکہ اس لیے کہ وہ پیدائشی طور پر انسانوں کے لیڈر تھے۔

''مسلم حکومت کے خاتمے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگیوں میں پیدا ہونے والے خلا کو سید احمد نے پُر کیا۔'' پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے اپنی مختصر تاریخ میں لکھا، ''انھوں نے دکھایا کہ ترقیات اور فلاح و بہبود کے میدان میں وہ ذمہ داریاں کس طرح پوری کی جاسکتی ہیں جو مسلم حکومتیں کیا کرتی تھیں۔ مگر سید احمد نے اس سے زیادہ کیا۔ ان کی لگ بھگ ایک صدی کے برابر کی زندگی نے برِصغیر میں قرونِ وسطیٰ اور جدید اسلام کے مابین ایک پُل کا کردار ادا کیا۔ خود عظیم مغل عہدِ بہار کی یادگار ہوتے ہوئے بھی وہ ایک نئے دور میں داخل ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ایک نئی یک جہتی، ایک نئی سیاسی پالیسی، نئے تعلیمی خیالات، شخصی اور قومی مسائل میں نئی رسائی، ایک نیا اندازِ تحریر دیا اور انھوں ایک ایسا ادارہ بھی دیا جو اپنے کام خود چلانے کے قابل تھا۔ Dr. Spear اپنی کتاب ''انڈیا، پاکستان اور مغرب'' میں سرسیّد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے پورے طرزِ عمل میں پاکستان کا تصور مضمر تھا۔

# نئی صدی کی آمد

## آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل

جنوبی ایشیا کی سیاست کے بارے ایک جامع تجزیے میں لارنس زائرنگ (Lawrence Ziring) لکھتا ہے، ''بیسویں صدی کی ابتدا کچھ اسی طرح ہوئی جس طرح کہ انیسویں صدی کا اختتام ہوا تھا۔ برطانیۂ عظمیٰ، دنیا کا مانا ہوا لیڈر تھا، کرۂ ارض کے پانچویں حصے پر حکومت کا دعوے دار، بارہ ملین مربع میل پر پھیلی ہوئی وسیع نوآبادیات جس میں زمین کی ایک چوتھائی آبادی رہتی تھی۔ اس وسیع و عریض شہنشاہی کی مرکزی آرائش برصغیر ہندوستان سے تھی، جہاں ۱۹۰۳ء میں ملکہ وکٹوریا کے انتقال پر ایڈورڈ ہفتم تخت نشین ہوا، جس کو لارڈ کرزن کی صدارت میں منعقد ہونے والے ایک عظیم دربار میں ہندوستان کے شہنشاہ کا خطاب دیا گیا۔۔۔۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کرۂ ارض میں ہونے والی تبدیلیوں کے پیشِ نظر ہندوستان کی انتظامیہ کاروباری فروغ کے خطے کے بجائے ایک سیاسی جغرافیائی اور جنگی اقدامات کے حوالے سے اہمیت اختیار کرگئی تھی۔ یورپی طاقتوں میں سلطنت بنانے کی جو دوڑ لگی ہوئی تھی اس کے پیشِ نظر برطانیہ نے بحرِ ہند پر قابو پانے کے لیے ہندوستان کی انتظامیہ کی تنظیم نو کی اور اس میں خاطر خواہ اضافے کیے۔

اس ضمن میں جو اقدامات کیے گئے ان میں ایک تو اس قانون کا نفاذ تھا جس کو 'Indian Councils Act of 1892' کا نام دیا گیا۔ اس قانون کے ذریعے قائم شدہ کونسلوں کے ارکان کی تعداد بڑھائی گئی اور ان کو انتظامی معاملات میں زیادہ اختیارات بھی دیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی آزاد خیال اور آئینی رواداری کی قومی تحریک میں ایک بنیادی تبدیلی ہوئی اور قومیت کے دعوے داروں کے شدت پسند بازو نے یورپی خیالات کے بجائے قدیم ویدوں سے اثر لینا شروع کیا اور انھوں نے اپنے مقاصد کے حصول تک مارکاٹ پر اُتر آنے کا عزم کرلیا۔ قومی شدت پسندی کی نئی سوچ کا اصل محرک بال گنگا دھر تلک (۱۹۲۰۔۱۸۵۶ء) تھا جس کو برطانوی مورخین 'ہندوستانی بے چینی کا باپ' کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۸۹۰ء کی دہائی میں قحط اور طاعون ہندوستانیوں کی پریشانی کا سبب بنے جن کی وجہ سے عام سطح پر بھی ہندوستانیوں کی شکایات بڑھتی چلی گئیں۔

ایسے واقعات سے ہندوستان سے باہر بھی قومیت کی تحریکوں کو تقویت ملی۔ اس مقام تک تو یورپ کی برتری کو کسی للکار کا سامنا نہیں تھا۔ صدی کے اختتامی زمانے میں کچھ ایسے واقعات ہوئے جن سے ایسا لگا گویا یورپ کی برتری کم ہوتی جارہی ہے۔ سونے پر سہاگا، روسی سلطنت پر ۱۹۰۵ء میں جاپان کی فتح نے ہندوستانی قوم پرستوں میں بجلی بھردی اور 'ایشیائیوں کے لیے ایشیا' کا نعرہ بلند ہوا جو چین، برما، ولندیزی شرق الہند اور ہندوستان کے جوشیلے نوجوان قوم پرستوں کا نعرہ بن گیا۔

جو کچھ خالص انتظامی آسانیوں کے لیے سوچا گیا تھا کہ مغربی بنگال کی انتظامیہ کا بوجھ ہلکا ہو، مشرقی بنگال کو نظر انداز کیے جانے سے پیدا ہونے والی محرومیوں کا ازالہ ہوسکے، اور آسام کو اس کی شدید ضرورت کے لیے سمندری بندرگاہ تک رسائی دی جاسکے، ۱۹۰۵ء میں

بنگال کی تقسیم بہت جلد ہی سیاسی اتھل پتھل اور ہنگاموں پر منتج ہوئی۔ بنگال اب ایسی شدت پسندی کی تحریک کا مرکز بن چکا تھا جو اپنی مطلب براری کے لیے تشدد کا سہارا لینے کے لیے تیار تھی۔ ان تحریکوں کے پیشِ نظر ۱۹۱۲ء میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاج پوشی کے موقعے پر منعقد ہونے والے دربار میں بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی گئی جو مشرقی بنگال کی مسلمان اکثریت کے لیے ایک دھچکا ثابت ہوئی۔ ہندو جذبات کی تشفی کے لیے ہندوستان کے دارلحکومت کی کلکتے سے مغل دارالحکومت دلّی کی منتقلی کی گئی مگر اس سے پیدا ہونے والے مسلم جذبات کے لیے کوئی رعایت نہیں دی گئی۔

بنگال کی تقسیم پر احتجاج اور اس کے نتیجے میں اس کی تنسیخ اور بہت سے سیاسی عناصر مسلمانوں کی سیاسی رائے عامّہ پر شدت سے اثر انداز ہوئے۔ مخلوط انتخاب کے بدلے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ ہوا جس کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اور مسلمانوں کی نوزائیدہ تحریک کے لیے یہ ایک پُرکشش نعرہ بن گیا۔ یہ جداگانہ انتخابات کا مطالبہ ہی تھا جس کی بنا پر نواب وقار الملک اور نواب ڈھاکا نے مشرقی بنگال کے شہر ڈھاکا میں ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس طلب کیا، جس کی بنیاد سر سید احمد خان نے ۱۸۸۶ء میں رکھی تھی۔ علی گڑھ تحریک کے سرخیلوں کے اس اجلاس میں ہونے والے تبادلۂ خیالات اور اس کے منطقی نتیجے کے طور پر آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ آغا خان، اور علی برادران محمد علی اور شوکت علی کے ہاتھوں جو سرسیّد کے انتقال کے بعد سے علی گڑھ تحریک کے روحِ رواں تھے، مسلم لیگ کے قیام کا باقاعدہ اعلان ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ لیگ کا پہلا اجلاس ڈھاکے میں ہوا تھا پھر ۱۹۰۷ء میں کراچی میں اور ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا۔

ڈھاکے میں منعقد ہونے والے ۱۹۰۶ء کے افتتاحی اجلاس میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو عرصۂ دراز سے سیاست کے میدان میں تھے اور جنھوں نے اپنے تجربات کی بنا پر یہ رائے قائم کی تھی کہ کانگریس مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتی اور قومی مفاد کی پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی اپنی کوئی باقاعدہ تنظیم ہونی چاہیے۔ بہت سے مسلم لیگی رہنما اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ایسے ادارے کی رکنیت رکھنا بے کار تھا جو کھلم کھلا فرقہ پرستی کی راہ پر گامزن ہو گیا ہو۔ اس طرح مسلم لیگ کا قیام تاریخی اعتبار سے پہلا قدم ثابت ہوا جس نے برِصغیر کے مسلمانوں میں نئی روح پھونکنے میں مدد دی۔

خود برطانیہ کے اربابِ اختیار نے مصنوعی ہندو مسلم تقسیم کی بنیاد رکھی تھی اور اس کے بارے میں تاریخ نویس بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ جب اس مسئلے کے وجود کو برطانوی اربابِ اختیار کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے بخوشی یہ بات قبول کر لی کہ کانگریس کو متوازن کرنے میں مسلم لیگ کا وزن اہم ثابت ہوگا۔ مگر ہندو مسلم تعلقات کے اس مرحلے پر برطانوی حکومت کا رسوخ نہیں بلکہ کانگریس کا ہندوؤں کی طرف جھکاؤ اصل مشکل تھی۔ یا جیسا کہ ایک مشہور ہندو مورّخ نے کہا تھا کہ ''دراصل یہ ہندوؤں کے شدّت پسند قومی رہبر تھے جنھوں نے ہندو مذہب کی بنیاد پر اپنے احتجاج کو آگے بڑھایا اور ہندوستانی قوم کی بیداری کو ہندومت کی شناخت دینے کی کوشش کی۔ اس عمل سے انھوں نے مسلمانوں کو قومی تحریک سے الگ تھلگ کر دیا اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ تشکیل کا راستہ ہموار کیا۔''

بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کی قومی تحریک میں خوف ناک حد تک بڑھتی ہوئی شدت پسندی اور دہشت گردی کے واقعات میں تیزی آنے کی وجہ سے اور انڈین نیشنل کانگریس کے اعتدال پسند حلقوں کی طرف سے عدم اطمینان کے اظہار کی وجہ سے برطانوی حکومت اس نتیجے پر پہنچی کہ ہندوستانی قوم کی توقعات پوری کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ قدم اُٹھانے ہوں گے۔ حالات بھی کچھ سازگار ہو گئے تھے اس لیے کہ ۱۹۰۵ء میں برطانیہ کی قدامت پسند (ٹوری) پارٹی کی شکست کے بعد ملک میں ایک آزاد خیال حکومت قائم ہو چکی تھی جو ہندوستان کی تنظیمِ نو کی طرف مائل تھی۔ ہندوستان کے قوم پرستوں کی برطانوی حکومت میں ہندوستانی امور کے وزیر لارڈ مورلے (Lory Morley) سے توقعات بھی کچھ زیادہ ہو چکی تھیں۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم ولیم گلیڈسٹن (William Gladstone) کے سوانح نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے والے اور زندگی بھر آزادی اور روشن خیالی کے سرخیل ہونے کے ناتے ہندوستان برطانوی حکومت کے ایک ذمہ دار افسر

لارڈ مورلے کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جس سے اس بات کی توقع کی جارہی تھی کہ وہ فراخ دلانہ انداز میں ہندوستان میں ایک خودمختار حکومت کی تشکیل کی ہمت افزائی کرے گا۔

۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان لارڈ مورلے اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ منٹو (Lord Minto) نے ہندوستان میں بڑھتی ہوئی قومیت کے مطالبات کے پیشِ نظر ہندوستان کی انگریز حکومت کو جو مکمل طور پر افسر شاہی کی جکڑ بندی میں تھی، آزاد کرنے کی ابتدا کی۔ تاجِ برطانیہ کی ہندوستان کی حکومت کی براہِ راست ذمہ داری لینے کی پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر ہندوستان کی رعایا کے نام ایک فرمان کے ذریعے شہنشاہ نے نمائندہ حکومت کے قیام کا اعلان کیا، جس کو ۱۹۰۹ء کے مورلے منٹو اصلاحات کا نام دیا گیا۔

ان اصلاحات کی سب سے متنازعہ خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مسلمان آبادی کے لیے گروہی انتخاب کنندگان (Communal Electorates) کی سہولت دی گئی تھی۔ اس سہولت پر عمل درآمد کے لیے، منتخب ہونے والی کونسلوں میں مسلمان آبادی کی یقینی طور پر نمائندگی کے لیے نشستیں متعین کردی گئی تھیں اور ان نشستوں پر فائز ہونے والے نمائندگان کا انتخاب مسلم گروہی انتخاب کنندگان کے ذریعے عمل میں آنے والا تھا۔ مزید برآں، مسلمانوں کی نمائندگی کی اہمیت بڑھانے کے لیے ان کو آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی جانی تھیں۔ ظاہر ہے کہ، مسلمانوں کے رہبر اس بات پر بہت خوش تھے اس لیے کہ ان کو خطرہ تھا کہ عام نمائندگی کے اصول کے مطابق انتخابات ہوئے تو یقیناً ان کی آبادی ہمیشہ کے لیے غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ جائے گی۔ یاد رہے کہ کانگریس نے کونسل ایکٹ ۱۹۰۹ء میں جداگانہ انتخابات کے اصول کو قبول کرلیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے ممتاز رہنماؤں میں سے ایک، گوکھلے، نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے دعوے کی حمایت بھی کی تھی۔ محمد علی جناح کے مطابق گوکھلے نے ۱۹۰۷ء میں عام اعلان کیا تھا:

''ہندوؤں کی غالب اکثریت کے مقابل مسلمان قدرتی طور پر خائف ہیں کہ ان کے معاملے میں برطانوی تسلط سے آزادی سے مراد ہندو کی غلامی بھی ہوسکتی ہے۔ اگر ہندو اسی نوع کی کیفیت میں ہوتے جیسے کہ آج مسلمان ہیں تو بلاشبہ ہم سب بھی اسی طرح کے خطرے سے دوچار ہوتے اور ہم نے بھی اسی قسم کی پالیسی اختیار کی ہوتی جیسی کہ آج مسلمانوں نے کر رکھی ہے۔''

میں اس کتاب کی وسعت اور اس کے متعینہ مرکزی مقاصد سے تجاوز کر جاؤں گا اگر اس موقعے پر اگلے چالیس برسوں میں ہونے والے واقعات کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کرنے کی کوشش کروں جس کی بنا پر ہندوستان کی آزادی عمل میں آئی اور بالآخر اس کا بٹوارہ ہوا۔ جیسا کہ میں نے اس کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے، میں اور میرے دوست روشن علی بھیم جی صرف یہ چاہتے تھے کہ اس کتاب میں ہم کچھ بنیادی حقائق اور واقعات پیش کردیں جو، بادی النظر میں، بتاسکیں کی ہندوستان کی تقسیم کیوں ہوئی۔ سلسلے وار ہونے والے واقعات کے نتیجے میں منطقی طور پر پاکستان کی تشکیل ہوئی جس کو نہ اس وقت کی سرگرمِ عمل تمام سیاسی قوتیں روک سکتی تھیں اور نہ ہی اپنی کوششوں کے باوجود، واقعات کے ریلے کو کسی نئی نہج پر ڈال سکتی تھیں۔

برطانوی راج سے 'آزادی' کا حصول اور بالآخر دو آزاد ملکوں کا قیام بہت سے عوامل کے وقوع پذیر ہونے کی وجہ سے ممکن ہوا۔ بلا شبہ یہ نتیجہ تھا بہت ساری بنیادی، ایک جیسی، کوششوں کا جو بالواسطہ اور براہِ راست ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے بیشتر محبوب مسلم اور ہندو رہنماؤں نے کیں۔

اس میں ایک اور اہم پہلو تھا ہندوستان سے باہر واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا ہے، ایشیا میں بلکہ تمام دنیا میں یورپ کی برتری زوال پذیر تھی جو برطانیہ عظمیٰ کے ایوانِ اقتدار 'وہائٹ ہال' اور دوسرے طاقت کے مراکز کے روشن خیال سیاست دانوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہوئی اور انھوں نے ہندوستان کے سلسلے میں نئے انداز سے سوچنا شروع کردیا۔ یہ سب کچھ ایک دم تو نہیں ہوا تھا۔ برِصغیر کی آئینی جد و جہد اور اس کے نتیجے میں بالآخر برطانوی حکومت کے بہت سارے اقدامات جن کے نتیجے میں 'گورنمنٹ

آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء منظور ہوا، اس بات کے بیّن ثبوت ہیں کہ یہ سب کچھ ایک طویل تکلیف دہ اورارتقائی عمل کے ذریعے ہوا۔ ان کے علاوہ یہ سب مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح جیسے عظیم رہنماؤں کے خود کو وقف کر دینے، ان کی القائی رہبری اور ان کی پیش بینی کا القائی نتیجہ تھا جنھوں نے بہت اور سر برآوردہ رہنماؤں کی مدد سے برطانوی آقاؤں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب کم از کم وہ وقت آ گیا ہے کہ ان کو تاجِ برطانیہ کے سب سے چمک دار نگینے سے اپنے روابط میں تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ یہ ان لوگوں کے لیے تکلیف دہ اور بدمزہ صورتِ حال رہی ہوگی جن کو آخرِ کار ان تمام اعمال کی ذمہ داری اُٹھانی تھی، برطانوی شہریوں کی نظر میں جو برطانیہ کے راج کی تقدیر کے بارے میں آخری فیصلے کر رہے تھے۔

ان لوگوں کے کارہائے نمایاں اور ان کے حصے کی کوششوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے سفر کی ابتدا اور اس کے خوش آئند اور کامیاب اختتام کے لیے اپنا تن، من، دھن، سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس تحریر کے ان قاریوں کو بھی جو خود اپنے ملک کی جدید تاریخ میں زیادہ دل چسپی نہیں رکھتے، تحریک میں شامل قد آور شخصیات کے حالات زندگی کا علم ہے۔ مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے حالاتِ زندگی نہ صرف تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں بلکہ درجنوں سوانح حیات، تاریخی اور سیاسی وقائع نگاری کی تصنیفات میں ان کی، جیسا کہ ان کا حق تھا، تحسین بھی ہو چکی ہے جو بھارت اور پاکستان کی ابتدائی تعلیم کی درسی کتب میں بھی موجود ہیں۔ اور اگرچہ یہ تحریر ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کے کردار تک محدود ہوگی، ۹ر جنوری ۱۹۱۵ء کے دن ہندوستان کے آسمانِ سیاست پر مہاتما گاندھی کے طلوع پر میں خود کو ایک نظر ڈالنے پر مجبور پاتا ہوں جب بمبئی میں اپالو بندر کے مقام پر ان کو خوش آمدید کہنے کی غرض سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا تھا۔ گاندھی، کے عظیم گُرو گوکھلے نے ۱۹۱۲ء میں جنوبی افریقا کے سفر کے دوران پیشین گوئی کردی تھی اور اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ گاندھی، ''بلاشبہ اس مٹی سے بنا ہے جس سے نابغہ روزگار اور شہدا تخلیق ہوتے ہیں۔ نہیں نہیں، اس شخص میں اس سے بھی کہیں زیادہ ایسی حیرت انگیز روحانی طاقت ہے جو عام انسانوں کو ہیرو اور شہدا میں تبدیل کر دیتی ہے۔''

اسی طرح، باپ اور بیٹے، دونوں نہروؤں کے کم از کم مختصر تذکرے ہی دل چسپی کا باعث ہوں گے تاکہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں تمام زندگی کی جانے والی ان کی کوششوں اور ذاتی قربانیوں کا اعتراف ہو سکے۔ شاید ان کے بڑے سے بڑے مخالف بھی ان کے تاریخی کردار اور ان کے قابلِ تعریف اعمال کو جھٹلانے میں خود کو مشکل میں پائیں گے۔ ایک کردار مہاتما گاندھی اور ان کے وفادار ساتھی، موتی لال اور جواہر کا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ قائدِ اعظم وہ پہلے شخص ہوتے جو برملا اعتراف کرتے اگر آزادی کے سفر میں ایک دوسرے کے سب سے بڑے مخالف کا کردار دونوں کا مقدر نہ ہو گیا ہوتا، جیسا کہ طرفین ایک دوسرے کو دھرتی ماتا کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہراتے رہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میں خود کو قومی آزادی کی اس عظیم جدوجہد میں مسلمانوں کے کردار تک محدود رکھوں گا جو، ان کے لیے ذومحاذی جنگ کے مترادف ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے لیے پہلا محاذ تو ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ مل کر برطانوی راج کے خلاف جدوجہد تھا۔ اور دوسرا محاذ، جو حقیقتاً زیادہ بڑا محاذ تھا، وہ اس ہندو راج کے خلاف تھا جو برطانوی راج کی جگہ ان پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔

اس سلسلے میں سرسید نے جو کردار ادا کیا تھا اس کا ذکر اس باب کے اوائل میں تفصیل سے کیا جاچکا ہے۔ ان کے ذریعے ہندوستان میں مسلمانوں کا 'نیا جنم' ایک سیاسی قوت کے طور پر شروع ہوا تھا جو آل انڈیا مسلم لیگ کی صورت میں ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا، جس کو بالآخر ہندو قومیت کے تسلط سے آزادی کے خلاف متحرک ہونا تھا جو ہندوستان میں برطانوی راج کا ممکنہ وارث بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ لہٰذا ہندو مبصروں نے مسلم لیگ کے قیام کو مسلم علیحدگی کی تحریک کا پہلا قدم قرار دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ اس کی بنیاد رکھنے والوں میں آغا خان جیسے لوگ تھے جن میں ایسی سر برآوردہ شخصیتیں بھی شامل تھیں جو اس وفد میں جو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ منٹو سے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملے میں ملا تھا، اور جس نے ملک کی اشرافیہ، ریاستوں کے وزرا، جاگیردار، وکلا، تجار اور جلالت مآب کی مسلمان رعایا کا دستخط شدہ

ایک خطاب پیش کیا تھا جس میں حکومت کے ہر طبقے میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمائندگی دیے جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک جداگانہ انتخاب کا حق، جو بالآخر ہندوستان کے مسلمانوں کو دیا گیا تھا، ہندوستان کے قومی دھارے سے ان کی علیحدگی پر منتج ہونا تھا۔

تاریخ داں آج بھی اس بات پر مختلف خیالات رکھتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ایک سوچا سمجھا 'کانگریس مخالف' اتحاد تھا جس کی ابتدا کے نتیجے میں آزاد ہندوستان کو دو خود مختار مملکتوں میں تقسیم ہو جانا تھا، یا پھر یہ قدرتی طور پر آل انڈیا کانگریس کے قیام کا منطقی ردِ عمل تھا جو مسلمانوں کی جانب سے ان کے جواب کے طور پر دیا گیا تھا۔ یہ اکثر کہا گیا ہے کہ برطانوی حکومت اور اس کے عمّال کی جانب سے کانگریس اور لیگ دونوں کے قیام کے سلسلے میں، بالواسطہ یا بلا واسطہ، جو امداد دی گئی تھی وہ برطانوی سیاست کی مکار چالوں کی ایک اور مثال تھی جس کو اگر ایجاز کا لباس دیا جائے تو 'لڑاؤ اور حکومت کرو' سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مسلم ہندو رقابت کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں تو زیادہ تر ہندو صحافیوں نے اس خلیج کو برطانوی سیاست کا نتیجہ قرار دیا اور اس مسئلے پر خلافت تحریک کے مشہور علی برادران کا وہ مشہور تبصرہ جو انھوں نے ۱۹۳۰ء لندن میں منعقد ہونے والی 'گول میز کانفرنس' کے موقعے پر کیا تھا ''ایک پرانی کہاوت تھی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' مگر یہاں تو محنت کی تقسیم اس طرح ہو رہی ہے کہ ہم لڑیں اور تم حکومت کرو۔''

ہم عصر تاریخ داں برطانویوں کے شاطرانہ کردار کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں جو انھوں نے دونوں سیاسی پارٹیوں، مسلم لیگ اور کانگریس، سے معاملت میں ادا کیا تھا۔ پاکستان کے سب سے سربرآوردہ تاریخ داں اور سیاسی مبصر پروفیسر خالد سعید نے ایک موقعے پر کہا تھا، ''جب لارڈ ڈفرن انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کی ہمت افزائی کر رہے تھے، ان کو معلوم تھا کہ کانگریس زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل جماعت ہوگی اس لیے کہ اس وقت ابھرتے ہوئے سیاسی منظر میں کہیں بھی مسلمانوں کا وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا اگر برطانیہ ہندوؤں کی اکثریت پر مبنی جماعت کی تشکیل کی ہمت افزائی کر سکتا ہے تو وہ مسلمانوں کو اسی قسم کے سیاسی کردار کے لیے کیوں نہیں اُبھار سکتا؟ شاید برطانوی حکومت کو احساسِ گناہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے غیر ضروری طور پر متنفر رہے ہیں اور یہ کہ اب وقت آ چکا تھا کہ، ہندو اور مسلمان، دونوں گروہوں کی نشو ونما میں ایک قسم کا توازن لانا ہوگا۔

ایک غیر جانب دار مغربی مبصر کے نقطۂ نگاہ سے میرے نزدیک اس مسئلے پر نزاع کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہیے۔ اور محمد علی جناح جیسے سربرآوردہ سیاسی رہنما نے بھی بہ ظاہر ایک مصنوعی اور نظریاتی مسئلے پر بحث میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ جب جناح صاحب نے قومی سیاست میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور وہ فوراً ہی پرچم برداروں میں شامل ہو گئے تو، دوسروں کی طرح انھیں بھی یہ ممکن معلوم ہوا کہ وہ دونوں تنظیموں سے روابط رکھ سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانی پہلے تھے اور اس طرح ان کے لیے ممکن ہوا کہ وہ، تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کے چیمپئن کے طور پر جانے گئے۔ وہ ۱۹۱۶ء کے ''معاہدۂ لکھنؤ'' کے معمار تھے اور اس کے اہم ترین سفیر گردانے گئے۔ جناح صاحبؒ اس وقت صدر نشین تھے جب، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے سالانہ اجلاس اس برس دسمبر کے مہینے میں لکھنؤ میں منعقد کیے۔ اور یہ وہیں کا واقعہ ہے جب انھوں نے فرمایا تھا، ''ہندوؤں کی جانب ہمارا رویہ دوستانہ اور برادرانہ جذبات کا ہونا چاہیے۔ اپنی دھرتی ماں کے مفاد کی خاطر ہمارا رہنما اصول 'امدادِ باہمی' ہونا چاہیے۔ ہندوستان کی حقیقی ترقی دونوں گروہوں میں سچی مفاہمت اور ہم آہنگ رشتوں ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اپنے معاملات ہم میں کسی اور پر نہیں صرف خود پر انحصار کر سکتے ہیں۔''

پروفیسر خالد بن سعید لکھتے ہیں ''میثاقِ لکھنؤ، ہندو مسلم اتحاد کا بلند نقشاب (watermark) تھا۔۔۔ یہ سب کچھ اس سیلاب کے ریلے میں بہہ گیا جو امرتسر کے سانحے اور خلافت کی تحریک کی وجہ سے اُٹھا تھا۔''

جناح صاحب نے ۱۸۹۷ء میں کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور اپنے سیاسی کردار کی ابتدا ہی سے وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں تھے۔ ۱۹۱۳ء میں جب وہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے پسندیدہ اور مؤثر رہنما تھے، جب وہ ایسی شخصیت بن چکے تھے جو ہندو

اور مسلمانوں دونوں سے اچھی رسم وراہ رکھتے تھے، انھوں نے باقاعدہ طور پر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ ایسے بہت سے لوگ جن سے راقم کو ذرا قربت رہی ہے، جیسے کہ میرے پیارے دوست روشن علی بھیم جی تھے، جو ایسی ہی تبدیلی سے دوچار ہوئے، یعنی برطانیہ کے خلاف لڑائی میں کانگریس کے مددگار تھے، ذرا دیر سے قائدِ اعظم کے مداح ہوئے، اور انھوں نے بھی اک ذرا تامل کے ساتھ اپنے قائد کی طرح، ملک کی تقسیم کو ضروری سمجھا۔

سرسید نے جب پہلی بار ہندوستان میں دو قوموں کے بارے میں اپنا خیال پیش کیا تھا، اس وقت شاید انھوں نے سیاسی طور پر اور بین الاقوامی قانون کے مطابق یہ نہیں سوچا تھا۔ شاید انھوں نے ہندوستان کی وسیع ہندو اکثریت کے تناظر میں بنیادی طور پر مسلمانوں کی شناخت کو اجاگر کرنے کے لیے اس قسم کی بات کی تھی۔

ایک اور عظیم مسلمان کے گونج دار خیالات ہندوستان میں مسلم اتحاد کے احیا پر اثر انداز ہوئے اور انھوں نے اپنے گروہ کی شناخت کو کامیابی سے حاصل ہونے والے آزادی کے بعد اقتدار میں شامل ہونے کے لیے ضروری جانا۔ سرسید اور قائدِ اعظم کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے حاصل ہونے والے خودمختار ملک پاکستان کے معماروں میں اہم اور مرکزی کرداروں میں ایک بڑا نام جو 'پاک سرزمین' کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں درج ہوا اور بہت بلند نظر آتا ہے وہ بلاشبہ عالمِ اسلام کے عظیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ہے۔